فیض نمبر

مجلس فکرِ نو ۸۹-۱۹۸۸ء

مجلس فکرِ نو کے اراکین چیئرمین شعبہ اردو ڈاکٹر انوار کے ساتھ

یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کے دلوں کی آواز

شعبۂ اردو

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

"مجلسِ فکرِ نو"

شعبۂ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

اس شمارے میں

صفحہ

عنوان	مصنف	صفحہ
پھر موسم گل آیا	اسد فیض	۴
بات ہم نے کی سوچا آپ نے ہے	یونس سہیل	۵
تاریک دور میں روشنی کا استعارہ	نسیم شاہد	۷

خاص رنگ

عنوان	مصنف	صفحہ
ادب اور یونیورسٹی کا آبرو ۔ ڈاکٹر انوار احمد سے ایک گفتگو	رپورٹ عشرت سلطانہ	۱۳

فیض رنگ :

عنوان	مصنف	صفحہ
فیض احمد فیض	ایلس فیض	۲۴
فیض کے دو عشق	ڈاکٹر قمر رئیس	۳۵
فیض اور کلاسیکی غزل	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۶
فیض احمد فیض کی علامتیں	تبسم کاشمیری	۵۳
فیض کا نظریہ فن	محمد صفدر میر	۵۹
فیض احمد فیض کی شاعری میں عالمی کلچر کے اجزا	صلاح الدین حیدر	۶۷
شخصیت فیض کی عظمت کی اساس	ڈاکٹر انوار احمد	۷۰
فیض کا نظریہ فن	نعمت الحق	۷۴

انٹرویوز :

عنوان	مصنف	صفحہ
فیض کی ایلس سے ۔ امرتا پریتم کی باتیں	امرتا پریتم	۷۸
ایلس نے فیض سے باتیں	امرتا پریتم	۸۲
فیض احمد فیض ۔ ایک انٹرویو (اقتباسات)	طاہر مسعود	۸۶
فیض سے ایک گفتگو (اقتباسات)	نصرت چوہدری	۹۵

یاد ہے فیض :

عنوان	صفحہ
حبیب جالب، احمد فراز، جاوید شاہین، قتیل شفائی، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، استاد دامن، منو بھائی	۱۰۳
منتخب کلام	۱۱۴

دھنک رنگ :

عنوان	صفحہ
نظمیں	۱۵۲
غزلیں	۱۵۹
پسندیدہ شخصیت کے نام پیغام	۱۶۹
پسندیدہ شعر	۱۷۱

نیا رنگ :

عنوان	صفحہ
بحیثیت فیض ۔ صلاح الدین حیدر کی تحقیق آزمائش	۱۷۹

پھر موسم گل آیا ہے

گذشتہ چند برس جہاں ہماری قومی اور سیاسی زندگی پر عجیبہ ب کشمکش کے عالم میں گذرے وہاں ادب میں بھی علامتیں، ان کہی کہانیاں اور گونگے بہرے لفظ در آئے تھے۔ لفظ اپنے معانی کھو چکے تھے، ادیب کا قاری سے رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔

دنیا بھر میں مزاحمتی ادب اور مظلوم عوام کے حوالے سے فیض ایک بار پھر شدت کے ساتھ یاد آئے کہ وہ بھی اس دوران ہمیشہ کے لئے لیے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

ستم یہ کہ ان کی عمر کے آخری برس وطن و انسان دوستی کے جرم کی پاداش میں وطن سے دور ہی گذری۔ اقبالؒ کے بعد اُس کی روایت کی توسیع فیض کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی وہ قلندر مزاج شاعر نگر نگر درد کے لنگر جپتا رہا گو اس دشت نوردی میں اس کے ہاتھ بھی زخمی ہوئے لیکن وہ اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں سے محبت کرتا رہا۔ عرب ممالک، فلسطین تیسری دنیا اور دنیا بھر کے مظلوم عوام اس کے ساتھ تھے جن سے ان کی زندگی کا تار تار بندھا ہوا تھا وہ تمام عمر اپنے سچے جذبوں کی معیت میں غربت، بھوک، ناانصافی کی گرہیں کھولتا رہا۔

فیض کا فکر و فن اور فلسفہ لازوال ہیں اب جبکہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تاہم ان کا ذہن اور فکری سرمایہ متاع لوح و قلم کی شکل میں ہماری راہنمائی کر رہا ہے۔ ——— یہ شمارہ جس میں ہم نے فیض کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اب تک مختلف جرائد میں شائع ہونے والے مضامین کا ایک انتخاب شامل کیا ہے، بیسویں صدی کے اس عظیم شاعر کے لئے خراج عقیدت کا ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔

اس کے علاوہ اس شمارے کا توشۂ خاص ممتاز دانشور نقاد اور محقق ڈاکٹر انوار احمد کا ایک تفصیلی انٹرویو جس میں انہوں نے نہایت خوبصورتی سے زندگی اور ادب کے مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ہم اس تعاون کیلئے انکے دلی طور پر شکر گزار ہیں ہم شعبہ اردو کے اساتذہ کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے ہر قدم پر ہماری رہنمائی کی۔
اس موقع پر ہم جناب نسیم شاہد اور اپنے دوستوں جناب افضل شیخ، جناب رضی الدین رضی اور جناب شاکر حسین شاکر کا بھی دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کی محبتیں بھی ہر قدم پر ہمارا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ اب آئیے اس حسین شمارے کے صفحات پلٹئے اور اس چمنستان میں سے اپنی پسند کا پھول چن لیجئے۔

اسد فیض

بات ہم نے کی ہے سوچنا آپ نے ہے

آج ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں وہ اس لحاظ سے دل خوش کن ہے کہ برسوں سے چھائے ہوئے آمریت کے سیاہ بادل چھٹ گئے ہیں اور جمہوریت کی، صبح کی سنہری کرنیں ہمارے در و بام کو منور کر رہی ہیں۔ تاہم اس کے باوجود تاریکی کے نمائندے جہالت اور منافقت کا لبادہ اوڑھ کر ان کرنوں کو نگلنا چاہتے ہیں۔ یہ گھڑی بڑی احتیاط کی متقاضی ہے۔ خاص طور پر نئی نسل کے لوگوں پر یہ کڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی روشن صبح کی حفاظت کے لئے متحد اور یکجا ہو جائیں۔ ان قوتوں کے سامنے اجالے کی دیوار بن جائیں۔ جن کا منشور حیات تاریکی کو جنم دیتا ہے۔ اس لئے کہ تاریک لمحوں میں ہی ان کی تمام تر منافقتیں اور مکروہ افعال پوشیدہ رہ سکتے ہیں۔ نئی نسل اس وقت جس دوراہے پر کھڑی ہے، وہ ایک ایسا پل صراط ہے جہاں پر ذرا سی لغزش بھی ایک پوری نسل کا زیاں بن سکتی ہے، بھوک، افلاس، کلاشنکوف کلچر، ہیروئن اور رشوت و بدعنوانی کے آسیب نئی نسل پر کچھ اس بری طرح سے اپنا تسلط جما چکے ہیں کہ اب اس نسل کے لئے سر اٹھا کر اوپر دیکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں رہا۔ دراصل اس ساری خرابی کی جڑیں ہمارے اس قومی رویے کی مٹی میں چلی گئی ہیں جس کا خمیر ذاتی مفادات کی ایک اندھی لہر سے اٹھا ہے۔ ہمارا معاشرہ ایک طبقاتی معاشرہ ہے۔ یہاں دو قسم کے سکول ہی نہیں، ہسپتال، رہائش گاہیں، سفر کے ذرائع، اشیائے خورد و نوش، غرض ہر چیز میں ہمارا طبقہ دو واضح فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو تعداد میں تھوڑا ہونے کے باوجود ملکی وسائل کے نوے فیصد حصے پر قابض ہے اور دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو تعداد میں ملکی آبادی کا نوے فیصدی ہے لیکن اس کے حصے میں دس فیصد قومی وسائل بھی نہیں آتے۔ یہی تفاوت ملکی اتحاد اور قومی یکجہتی میں وہ دراڑیں ڈال رہا ہے، جس کا نمایاں اظہار کراچی اور حیدرآباد کی صورتحال سے ہو جاتا ہے۔ اگر نوجوانوں کے ذہنوں میں جھانکا جائے تو نظر آئے گا کہ ہر نوجوان کے اندر نفرت اور بے اطمینانی کا ایک لاوا پک رہا ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ اسے ایک ایسا مستقبل دیا جا رہا ہے جس میں یقین نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے ضرورت صرف اور صرف اس بات کی ہے کہ نوجوانوں کے ذہنوں کو وہ اطمینان دیا جائے جو ایک محفوظ مستقبل کے سچے خواب سے جنم لیتا ہے۔ اور یہ اطمینان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب معاشرے سے ناانصافی، رشوت ستانی، بدعنوانی اور بے روزگاری کے عفریت کو نکال باہر کیا جائے۔ غور کیا جائے تو آج کا نوجوان

پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کلاشنکوف کی نہیں کتاب کی ضرورت ہے لیکن مفاد پرست قوتیں اسے کتاب سے دور رکھ کر کلاشنکوف کے قریب لانے کی تگ و دو میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ یہ ساری باتیں نئی نہیں ہیں۔ بے شمار مواقع اور جگہوں پر ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ البتہ ہم نے یہ باتیں اس خیال سے دہرائی ہیں کہ برائی کے خلاف جدوجہد اس وقت تک جاری رہنی چاہیئے جب تک اس کا مکمل قلع قمع نہیں ہو جاتا۔

”فکر نو“ کا یہ تازہ شمارہ اپنے اندر ایک متنوع دنیا لئے ہوئے ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت فیض احمد فیض کے لئے علیحدہ گوشہ ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ فیض کی شخصیت و فن کے حوالے سے وہ تمام اہم مضامین اور انٹرویو اس میں شامل کر دیئے جائیں جو اس عظیم شاعر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ تاکہ ان طلبہ و طالبات کو جو فیض کے حوالے سے کچھ جاننا چاہتے ہیں ”فکر نو“ ایک حوالہ جاتی دستاویز بن جائے فیض کو محبت اور انقلاب کا شاعر کہتے ہیں۔ ہم محبت کے بھی قائل اور انقلاب کے بھی۔ انقلاب ہمارے نزدیک اس نظام کی تبدیلی کا نام ہے جس میں انسان انسان کو استحصال کرتا ہے۔ اور محبت ہمارے نزدیک وہ طرز زندگی ہے جس میں ایک انسان کی زندگی، دوسرے انسان کی زندگی کا باعث بن جاتی ہے جہاں ”میں“ کی تکرار ختم ہو جاتی ہے اور ”محبت“ زندگی کا بنیادی محور بن جاتا ہے۔ گویا محبت اور انقلاب دونوں ہی زندگی کی بنیادی قدریں ہیں۔ ان دونوں کی حفاظت کرنا اور انھیں ایک مثبت انداز سے تکمیل کی منزل تک پہنچانا ایک باشعور انسان کی ہی کمٹ منٹ ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ البتہ محبت کا جذبہ اس لئے زیادہ افضل اور برتر ہے کہ اس میں صرف خیر ہی خیر۔ حسن ہی حسن ہے اور نیکی ہی نیکی ہے۔ انسانیت سے محبت اور انسانیت کے احترام سے بڑھ کر شاید ہی کوئی نیکی خالق کائنات نے اس زمین پر اتاری ہو تو اس مرحلے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان آخر اس نیکی سے دور کیوں ہو چکا ہے؟ اس سلسلے میں یہ سوچنا بھی ہم سب کا بنیادی فریضہ ہے کہ انسان بذات خود اس نیکی سے دور ہوا ہے یا بعض مکروہ، مفاد پرست اور شیطانی قوتوں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے انسان اور محبت کے درمیان یہ دوئی پیدا کی ہے۔ بات ہم نے کہی ہے سوچنا آپ نے ہے!

یونس سہیل

تاریک دور میں روشنی کا استعارہ

نسیم شاہد کی "فکرِ نو" کے لئے خصوصی تحریر

لاہور میں جمہوریت پسند مصنفین کی کانفرنس کی بہت سی سوغاتوں میں سے ایک سوغات
وہ جملہ بھی تھا جو ڈاکٹر انوار احمد نے افتتاحی سیشن میں خطاب کے دوران ادا کیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہم پنجاب
کے اندر ایک چھوٹے سندھ میں رہ رہے ہیں اس جملے کی کاٹ صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جنہیں مسائل
نے گھیرا ہوا ہے جنہیں اس بات کا شدت سے احساس ہو گیا ہے کہ پنجاب کو صرف لاہور تک
محدود کر دیا گیا ہے اور جنوبی پنجاب کے سبھی علاقے اپنے حقوق کے سلسلے میں "نو مین لینڈ" کا درجہ اختیار
کر چکے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے چاروں طرف احساس محرومی کا گہرا آسیب موجود ہے۔
بات شروع کی تھی ڈاکٹر انوار احمد سے۔ جس بات کو میں مندرجہ بالا سطور میں بڑی شکل سے بیان
کر پایا ہوں، اسے ڈاکٹر انوار احمد نے کتنی خوبصورتی سے صرف ایک مختصر سے جملے میں بیان کر دیا ہے
کہ ہم پنجاب کے اندر ایک چھوٹے سندھ میں رہ رہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ جملہ نہایتی تخلیقی رنگ
کا حامل ہے اور ایسے جملے صرف انوار احمد ہی بول سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کی رونمائی کی تقریب
ہو یا مزاحمتی ادب پر سیمینار ڈاکٹر انوار احمد کی گفتگو کا شدت سے انتظار کیا جاتا ہے۔ افسانہ،
ڈاکٹر انوار احمد کے مزاج کا ایک بنیادی جزو ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دونوں ایک دوسرے
کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح کوئی ڈرامہ نگار اپنی روزمرہ گفتگو میں بھی ڈرامہ بولتا ہے اُسی طرح
ڈاکٹر انوار احمد کی ہر بات میں افسانے کا سا ذائقہ موجود ہوتا ہے۔ اُردو افسانہ ڈاکٹر صاحب کا اوڑھنا بچھونا
ہے اور اس کا بخوبی اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے اُن کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں
کا محور افسانہ ہی ہے وہ ایک بے رحم افسانہ نگار، خطرناک محقق اور سفاک نقاد ہیں تاہم جہاں یہ خطرناک
خصوصیات ان کی ادبی زندگی میں موجزن نظر آتی ہیں۔ وہیں ان کی اپنی شخصیت میں محبت،
خلوص، سچائی، اور دیانت داری کے عناصر وافر تعداد میں یکجا نظر آتے ہیں۔
بلکہ اگر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اُن کی شخصیت اپنی چار خصوصیات کے تانے بانے کا
پرتو نظر آتی ہے تو بالکل بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر انوار کے فلسفۂ حیات میں ایک چیز بالکل ناپید نظر آتی

ہے اور وہ ہے مصلحت پسندی۔ جب سارا زمانہ اس بات کے لئے دلائل تلاش کرنے پر تلا ہوا ہے کہ مشکل لمحات میں مصلحت سے کام لینا جائز ہے تو اس زمانے میں ڈاکٹر انوار احمد اپنے قول وعمل سے ثابت کر رہا ہے کہ مشکل لمحوں میں ہی آدمی کے انسان ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے اور مصلحت ایسے لمحات میں وہ خود فریبی ہے جو وقتی طور پر آدمی کو گرنے سے بچانے کا فریب دیتی ہے لیکن دراصل اسے ایک ایسی گہری کھائی میں اتار دیتی ہے جہاں سوائے ذلت و رسوائی اور بے ضمیری کے اور کسی قسم کی مخلوق کا گذر نہیں ہوتا۔ مصلحت پسندی سے ڈاکٹر انوار احمد کی یہ دوری کسی حادثاتی لمحے کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ سب کچھ اس کی زندگی کے لمحے لمحے کی روداد سے نمودار ہوا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کی زندگی ایک سیلف میڈ آدمی کی زندگی ہے۔ ہمارے معاشرتی سٹرکچر میں غریب یا متوسط طبقے کے آدمی کو یا تو آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا یا پھر اس کے راستے میں اس قدر اونچی دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں جنہیں پھلانگنے کے لئے اسے اپنا ضمیر اور آزادی اظہار ان لوگوں کے ہاں گروی رکھنا پڑتی ہے جو ایسی دیوار پار کرانے کے لئے مصلحت اور جھوٹ کی سیڑھیاں فراہم کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر انوار احمد کا شمار ان خوش قسمت لوگوں میں ہوتا ہے جو اس جلتی ہوئی آگ میں بھی اپنی پگڑیاں صحیح وسالم بچا کر لے جاتے ہیں۔ کچھ اس مہارت اور دلیری کے ساتھ کہ انہیں اس سلسلے میں کسی کی مدد لینا پڑتی ہے اور نہ ہی اپنی انا کو آقائے وقت کی قربان گاہ پر چڑھانا پڑتا ہے۔ دراصل تاریک سے تاریک دور میں بھی روشنی کا ایک راستہ ضرور کھلا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس راستے سے گزرنے کے لئے جان سے گزرنے کا حوصلہ درکار ہوتا ہے اور یہ حوصلہ ڈاکٹر انوار احمد کے ہاں مجھے ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی صورت نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس وقت ایک کامیاب افسانہ نگار، نقاد اور محقق ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شعبہ اردو زکریا یونیورسٹی ملتان کے چیئرمین ہیں۔ لیکن یہ سب ان کے ثانوی حوالے ہیں۔ ایسے حوالے بہت سے دوسرے لوگوں میں بھی نظر آجاتے ہیں لیکن زندگی کو ایک مشن، ایک نصب العین اور ایک واضح نظریۂ حیات کے تحت گزارنے والے ہر معاشرے میں گنتی کے چند لوگ ہی ہوتے ہیں اور میں ڈاکٹر انوار احمد کو ان میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ میں عام آدمی کی بات نہیں کرتا۔ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو بہت قریب سے دیکھنے [illegible] باتیں سننے کے بعد میں جو تضاد ہماری ادبی برادری میں نظر آتا ہے وہ اپنی [illegible] میں نہیں ہے۔

لگتا کہ معاشرے کے باقی طبقے روحانیت کی آخری منزلوں کو چھو رہے ہیں۔ شاید میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ادیبوں کی برادری ہی ایک ایسا سہارا ہے جس کی طرف سسکتا اور بددیانتی کی منہ زور لہروں میں اُلجھا ہوا معاشرہ لاچار نظروں سے دیکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہسپتالوں کے برآمدوں میں پڑے ہوئے مریض آنے والے ہر ڈاکٹر کو اپنا مسیحا سمجھ کر بے چارگی اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں لیکن جس طرح مریض ڈاکٹروں کی ہوسِ زر کو دیکھ دیکھ کر مایوس ہو چکے ہیں اسی طرح معاشرہ بھی اپنے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی بے حسی سے تنگ آ کر انہیں اپنے درد کا درماں سمجھنے کی روش کو ترک کر چکا ہے۔ یہ بے حسی اپنے اردگرد سے لاتعلقی ہی نہیں بلکہ اپنے نصب العین کو پسِ پشت ڈالنے سے بھی منسلک ہے تاہم اس کے باوجود اگر ادیبوں شاعروں کی تھوڑی بہت یا کسی معاشرتی کارنر میں کوئی عزت و توقیر ہے تو اس کا سبب میرے نزدیک ڈاکٹر انوار احمد جیسے ادیب ہیں جن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن کے قول و عمل میں رتی برابر تضاد نہیں ہے۔ جو ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنے اندر کی بات کو زبان پر لانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں لاہور کی جمہوریت پسند مصنفین کی کانفرنس میں جب کشور ناہید نے یہ اعتراض کیا کہ پہلے اجلاس کی پریذیڈیم میں کسی خاتون کی نمائندگی نہیں ہے تو کانفرنس کے منتظمین نے اس کا یہ اعتراض رد کر دیا تھا۔ تاہم یہ ڈاکٹر انوار احمد ہی تھے جو اسٹیج پر سے اُتر آئے اور کہا کہ کسی کو تو کشور ناہید کا ساتھ دینا چاہیئے۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ کشور ناہید کا مطالبہ درست تھا یا نہیں بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ کشور ناہید اس سمے ایک مظلوم کردار تھی اور ڈاکٹر انوار احمد نے ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اُس کا ساتھ دیا۔ یہ بات دراصل ڈاکٹر انوار احمد کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ نہ صرف سچ بات کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والے تمام "مصائب" کو برداشت کرنے کے لئے بھی دلی طور پر تیار رہتا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کوئی مذہبی آدمی نہیں ہے ان معنوں میں کہ اس نے مذہب کو کبھی اپنی شخصیت کی آڑ نہیں بنایا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے مذہب کے نام نہاد علمبرداروں سے زیادہ صوفی نظر آتا ہے اگر تو مذہب اس بات کا نام ہے کہ اللہ کے بندوں سے محبت کی جائے اور اُن معیارات کو سختی سے اپنی شخصیت کا جزو بنا لیا جائے جو مذہب نے اپنے پیروکاروں کے لئے رکھ چھوڑے ہیں، تو مجھے ڈاکٹر انوار احمد سے زیادہ مذہبی آدمی اور کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ نہ صرف انسانوں سے مروت و محبت کرنے کا عادی ہے بلکہ اُس نے خود کو اس قدر بے ضرر بنا لیا ہے کہ عدو کی طرف سے آنے والا

زہر میں بجھا ہوا تیر بھی اپنی پوری زہرناکی کے ساتھ صحیح وسالم اس کے بطن میں اتر جاتا ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ ڈاکٹر انوار احمد ایک عملی آدمی ہے، وہ اس بات کو ہمیشہ سختی سے پیش نظر رکھتا ہے کہ وہ کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں۔ یونیورسٹی کا ایک طالب علم دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا تو اس کی قل خوانی میں سوائے ڈاکٹر انوار احمد کے یونیورسٹی کا کوئی استاد شریک نہ تھا۔ حالانکہ یونیورسٹی میں مذہب کے ایک سے بڑھ کر ایک نام لیوا موجود تھے۔ ایسی ہی باتوں کو پیش نظر رکھ کر میرا یہ خیال یقین میں بدل جاتا ہے کہ ڈاکٹر انوار احمد کے اندر ایک صوفی، ایک درویش اور باعمل عالم چھپا بیٹھا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد میرے نزدیک ایک نظریاتی آدمی بھی ہے لیکن اس کا نظریہ ان نظریات سے لگا نہیں کھاتا جو عموماً ہماری زبانوں پر چڑھے رہتے ہیں اور جنھیں بنیاد بنا کر ہم ایک دوسرے کا استحصال کرنے کو عین اپنا فریضہ سمجھتے ہیں ڈاکٹر انوار احمد کا نظریہ محبت کا فروغ ہے اس کا نظریہ دراصل ایک ایسی دنیا کا خواب ہے جہاں انسان کا احترام ہے میں سمجھتا ہوں دنیا کا سب سے مشکل اور دشوار ترین نظریۂ حیات انسان دوستی اور احترام انسانیت ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے جس پر کاربند ہونے کے لئے آدمی کو اپنے اردگرد رینگنے والے منافقت، جھوٹ، فریب اور مفاد پرستی کے اژدھوں کی گرفت سے اپنی ذات کو آزاد کرانا پڑتا ہے۔ اور یہ کم از کم ہمارے معاشرے میں کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے کیوں کہ ہمارے معاشرے میں منفی قدروں کی جگہ لے چکی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر انوار احمد مجھے اس مشکل راستے کو بڑی ثابت قدمی سے پاٹتا نظر آتا ہے وہ نفرت کی شدید سے شدید آندھی میں بھی محبت کی شمع جلانے کا قائل ہے اور نجانے اس کے پاس ایسا کونسا جادو ہے کہ اس شمع کو بہر طور جلائے رکھتا ہے محبت کی یہ شمع کل بھی اس کی شخصیت کے مرکزی ایوان میں روشن تھی اور آج بھی پوری آب و تاب سے روشنی بکھیر رہی ہے اس لئے میں اسے روشنی کا استعارہ کہتا ہوں یہاں میں تھوڑا سا خود غرض ہو گیا ہوں یعنی یہ کہ صرف میں اسے روشنی کا استعارہ سمجھتا ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے ملنے والا ہر شخص اس بات کو دہراتا ہے اور کسی تاریک موسم میں لوگوں کے لئے روشنی کی کسی مسلسل لکیر کی دریافت ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتی۔

٭ ٭ ٭
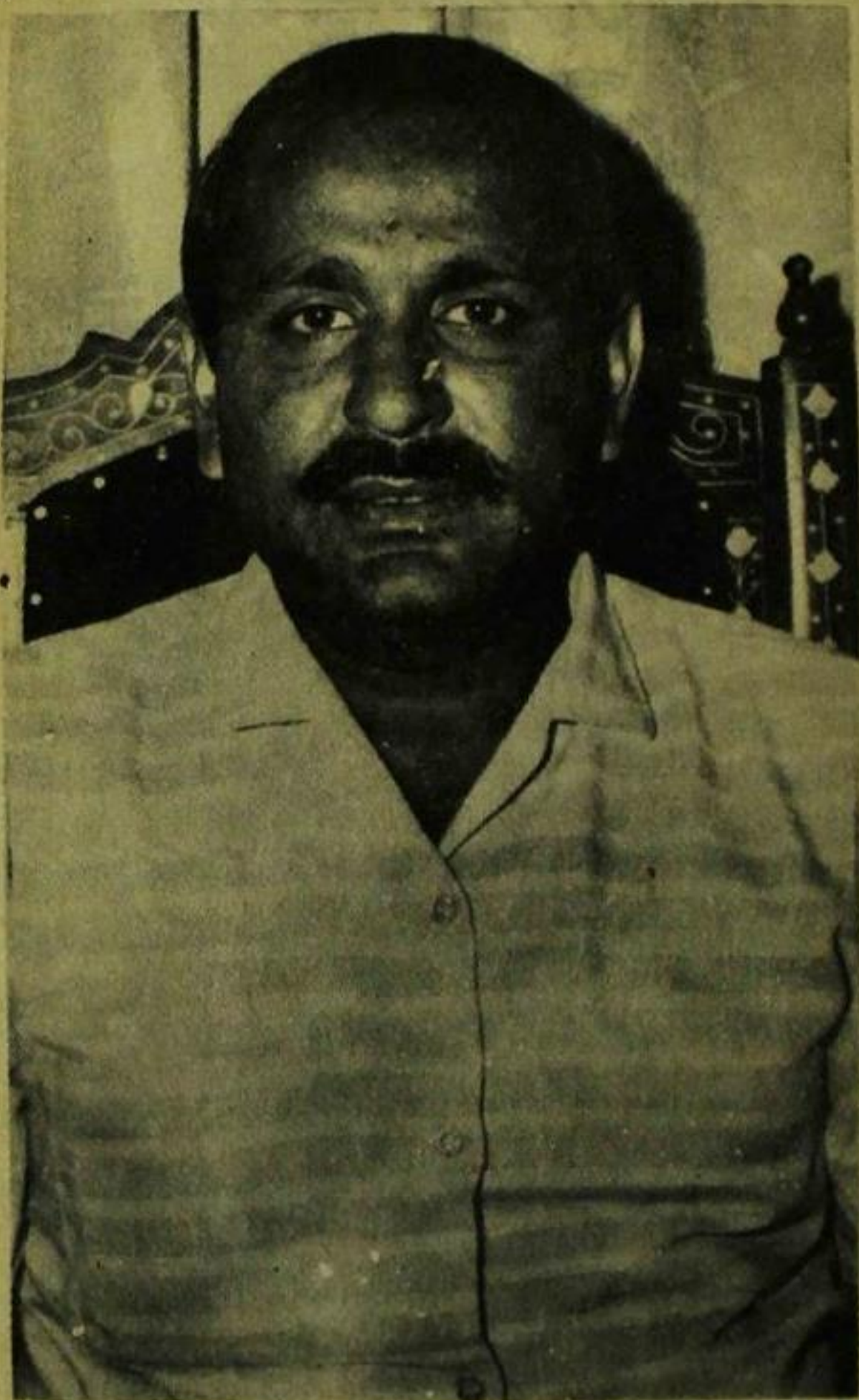
ڈاکٹر انوار احمد

ادب اور یونیورسٹی کی آبرو

ڈاکٹر انوار احمد سے ایک گفتگو

انٹرویو پینل : اجلال حیدر نقوی، تسنیم کوثر،
اسد فیض، حمیرا کمال،
یونس سہیل، عشرت سلطانہ

رپورٹ : عشرت سلطانہ

روشن اور جھپتی ہوئی آنکھیں، باریک ہونٹ جن پر مسکراہٹ آئے تو بہت بھلی سی لگے۔ کشادہ پیشانی جو گزرتے وقت کے ساتھ بالوں کی رخصتی کی وجہ سے کچھ مزید کشادہ ہو گئی ہے۔ درمیانہ قد اور درمیانہ ہی جسم۔ یہ ہے ہلکا سا حلیہ اس شخصیت کا جس کا انٹرویو آپ ان صفحات پر پڑھیں گے۔ اس شخصیت کا نام ڈاکٹر انوار احمد ہے اور اب ملک کا شاید ہی کوئی پڑھا لکھا فرد ہو جو ان کے نام سے آشنا نہ ہو۔ ڈاکٹر انوار احمد بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کی آبرو ہیں۔ انھوں نے زندگی کو جس ڈگر پر گزارنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ اس پر چلنے کی ہمت بیسویں صدی کے ہمارے معاشرے میں بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے قلم کی نوک پر آیا ہوا اچھا جملہ ضائع نہیں کرتے بندہ ضائع کر دیتے ہیں۔ ایک اور خوبی یہ بھی ان کے ان کے حصے میں آتی ہے کہ وہ اپنی تحریر اور تقریر میں استعمال ہونے والے لفظوں کو اُن کی شہ رگ سے پکڑتے ہیں۔ اور بقول افضل شیخ ڈاکٹر انوار احمد کے قول و فعل کی مطابقت ان کے طالب علموں کو زندہ رہنے کی

کی نئی راہیں متعین کرتی ہیں۔ شعبۂ اردو کے آج تک جتنے بھی طلباء و طالبات حصول تعلیم کے بعد زندگی کے مختلف میدانوں میں سرگرم عمل ہیں ان سب کی متفقہ رائے یہ ہے کہ شعبۂ اردو میں جس شخصیت نے ان کے کردار کی صحیح معنوں میں تعمیر کی ہے تو وہ ڈاکٹر انوار احمد ہی ہیں۔ اسی خوبصورت، ہر دلعزیز اور ذہن و دل میں شعور و فکر کی لہر دوڑانے والی شخصیت سے "فکر نو" کے لئے ایک خصوصی گفتگو کی۔ جس کی تفصیل اس اعتماد کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے کہ اس سے خوابیدہ ذہنوں میں زندگی اور افسردہ دلوں میں عزم، حوصلے اور امید کی مسرتوں بھری روشنی پیدا ہو گی۔

س:۔ ڈاکٹر اے۔ بی اشرف کے بعد چیئرمین بننا کیسا لگا؟

ج:۔ کمرے کے باہر اشرف صاحب کی تختی موجود ہے اور کمرے کے اندر ان کی کرسی خالی پڑی ہے۔ میں اسے ایک عارضی انتظام کے طور پر لیتا ہوں اور میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ دوسرے نمبر پر کسی بھی شعبے میں کام کرنا محفوظ ہے۔ ڈاکٹر اے۔ بی اشرف ہمارے استاد ہیں۔ ان کے زیر تربیت ہم نے کام کیا ہے۔ اس کے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوئی لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا ٹیچر کا رول متاثر ہوا ہے۔ اور یہی میری زندگی کا بنیادی مقصد رہا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو پڑھاؤں ان کے کام آؤں۔ وہ کام متاثر ہوا ہے۔

س:۔ اپنا سوانحی خاکہ پیش کریں؟

ج:۔ بعض لوگوں کے لیے زندگی کے کچھ خاص واقعات اہم ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو خاندان کے فضائل بیان کرنے میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ اب پتہ نہیں کہ کس ترتیب سے بات ہونی چاہیئے۔ بحر حال سیدھی سی بات یہ ہے کہ میرے دادا ایسٹ پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ دادی ملتان سے تعلق رکھتی تھیں اس طرح سے ہمارے کنبے میں آدھے پنجابی بولنے والے اور آدھے سرائیکی بولنے والے تھے۔ تقسیم سے بہت پہلے میرے دادا ملتان میں آگئے۔ ہم لوگوں کی خاندانی وابستگی پوسٹ آفس سے ہے۔ میرے دادا اور والد دونوں سب ماسٹر تھے جب میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا تو اس وقت میرے دادا انتقال کر گئے۔ جب ساتویں آٹھویں میں پڑھتا تھا

اس وقت میری والدہ نے دوسری شادی کر لی۔ وہ عارضی طور پر ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہم پانچ بہن بھائی تھے سب سے بڑا میں تھا۔ میں اپنی بہنوں کے ساتھ کارخانے میں کام بھی کرتا تھا اور پڑھتا بھی تھا۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ میٹرک کے بعد بھی میں پڑھ سکوں گا۔ اس طرح سے ہر طرف سے ناکامی اور مایوسی جو ذاتی زندگی میں ہو سکتی ہے وہ تھی۔ لیکن اس کا ازالہ میں تعلیمی میدان میں کرتا رہا۔ ہر امتحان کے بعد مجھے وظیفہ مل جاتا تھا۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو آمادہ کر لیتا تھا کہ دو برس اور پڑھنا ہے۔ اس طرح سے ایم۔ اے ہو گیا۔ جب بھی میں پلٹ کر دیکھتا تو خود درحمی پیدا ہوتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں کائنات میں تنہا تھا اس لیے یہ سب کچھ ہوا لیکن ٹیچر بننے کے بعد یا اس سے ذرا پہلے مجھے لوگوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کا موقع ملا۔ مجھے اندازہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اتنے دکھ اور محرومیاں ہیں کہ ہماری ذاتی محرومیاں ان کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

دوسرا زندگی میں ایک رویہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی محرومیاں کا مقبرہ بنا کر خود مجاور بن کے بیٹھ جائے یا انہی کی نمائش لگاتار ہے۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی کہ جو ہماری محرومیاں تھیں ان کے باعث جہاں میں محروم لوگوں کے ساتھ دل جوئی کی تھوڑی بہت صورت نکالی جائے۔ میں کسی کو منع نہیں کرتا کہ وہ میرے پاس نہ آئے یا اپنا مسئلہ پیش نہ کرے۔ جو کچھ مجھ سے بن پڑتا ہے۔ میں کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی ایک راستہ ہے

س:۔ ادب میں آپ فکشن کی طرف کیوں آئے؟

ج:۔ اصل میں افسانہ میں نے بہت پڑھا تھا اور ویسے بھی میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اختصار سے بات کروں۔ جس میں میری کوشش ہوتی تھی کہ کچھ باتیں مخاطب بھی سمجھے۔ ساری باتیں وضاحت کر کے تفصیل سے نہ بیان کی جائیں۔ اس مناسبت کے باعث مجھے افسانہ زیادہ قریب لگا۔ شعر کہنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ سے ہوا نہیں اس لیے میں نے چھوڑ دیا۔

س:۔ افسانے میں کس سے متاثر تھے۔

ج:۔ افسانے میں شروع سے ہی میں منشی پریم چند پھر منٹو اور بعد میں پھر بیدی اور غلام عباس سے متاثر ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آرٹ کے اعتبار سے غلام عباس اور راجندر سنگھ بیدی بڑے افسانہ نگار ہیں۔ البتہ میری ذہنی مناسبت منٹو کے ساتھ ہے

ہر سچے مذہب کا جوہر احترام انسانیت ہی ہوتا ہے

مولوی کے مقابلے میں صوفی زیادہ انسان دوست ہوتا ہے

س :۔ آپ کے بہت سے افسانے علامتی تھے۔ کیا آپ مستقبل میں بھی علامتی افسانے لکھیں گے۔؟

ج :۔ سارے افسانوں میں تو نہیں البتہ بعض افسانے ایسے تھے، جن کے موضوعات سیاسی تھے۔ ایسے دور میں جب سیدھے سادے انداز میں بات کہنا آسان نہ ہو تو ایسا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے، جس میں زود قاری کے اخذ کرنے کے لئے بھی بہت سا مواد ہو اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ موضوع ہوتا ہے جو افسانہ نگار سے یہ طے کرواتا ہے کہ اس نے علامتی انداز اختیار کرنا ہے یا سادہ۔ اس لئے میں پہلے بھی علامتی افسانے لکھتا رہا ہوں۔ اور مستقبل میں بھی لکھتا رہوں گا۔

س :۔ کیا افسانے میں علامت نگاری سے اس کا ابلاغ متاثر نہیں ہوا؟

ج :۔ افسانہ نگار کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ ایسی علامتیں یا ایسے معنی خیز اشارے چھوڑ جائے جن کے ذریعے قاری اس بات کی تہہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے یہی میں کرتا ہوں لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ لوگ بھی ان علاقوں کی وجہ سے آپ کی بات نہیں سمجھ سکتے جو آپ کے بہت قریب رہتے ہیں۔ مثلاً میں نے کچھ افسانے اردو اکادمی میں پڑھے تو مجھے حیرت ہوئی کہ میرے دوست اصغر ندیم سید اور عبدالرؤف شیخ بھی ان کے موضوع کو نہ سمجھ سکے۔ اس پر میں نے دوبارہ ان افسانوں پر غور و فکر کیا اور ان کی علامتیں زیادہ سہل بنا دیں۔ دراصل اس زمانے میں لوگ سمجھتے تھے کہ ہمارے اردگرد چھائی ہوئی خوف کی رات کا سبب کیا ہے وہ علامتوں کی زبان سمجھنے میں آسانی محسوس کرتے تھے۔ خوف کا ایک میرا ذاتی تجربہ بھی تھا میں جس گھر میں رہتا تھا وہاں اکثر بچھو نکلتے تھے اس لئے میں جب رات گئے گھر آتا تو مجھے یوں لگتا جیسے کمرے میں بے شمار بچھو گردش کر رہے ہیں۔ لائٹ جلا کر میں کئی بچھوؤں کو مار دیتا اور پھر لائٹ آف کر کے سوجاتا یہ میرا ذاتی خوف اور دوسرا اپنا ماحول کے دور کے نظام کو دیکھ کر پیدا ہونے والا دکھ، یہ ایک کرب تھا۔ اس زمانے میں بہت

ہمارے ہاں ہمہ وقتی ادیب کا کوئی تصور نہیں

ایک افسانہ "پرزِسٹرڈ ٹرف" لکھا جس میں یہ بات کہی کہ زمین کے اوپر ایک مصنوعی زمین بچھا دی گئی ہے۔ ہمارا اس زمین میں حقیقی رشتہ پیدا نہیں ہونے دیا گیا۔ حالانکہ انسان کا ایک بنیادی حوالہ زمین سے ہی بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان دولخت ہوا تو لوگوں نے کہا کہ ہمارے عقیدے کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا کیونکہ بنگلہ دیش کا مذہب بھی اسلام ہے۔ اس بے حسی کے بارے میں میں نے یہ افسانہ لکھا۔ اس زمانے آسٹروٹرف جو نئی نئی آئی تھی۔ اس لیے یہ علامت صرف وہی لوگ سمجھ سکے جن کا سپورٹس سے تعلق تھا۔

۱۳س:۔ آپ کی صرف ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس سست رفتاری کا سبب کیا ہے؟

ج:۔ میرے لئے ٹیچر ہونا مقدم بات ہے میرے لئے یہ بہت مشکل بات ہے کہ مجھے یہ کہا جائے کہ میں دو ماہ کی چھٹی لے کر کتاب لکھوں۔ میں درس و تدریس سے کسی بھی طرح تعلق نہیں توڑ سکتا۔ دوسرا کام بھی مشکل ہے میں یہ نہیں چاہتا کہ اپنے پیسوں سے کتاب چھپواؤں اور اس طرح اپنے بچوں کا حق ماروں اور اس کے بعد گلی گلی یہ صدائیں دوں کہ کتاب چھپ گئی ہے براہِ کرم اسے خرید لیجئے۔ میرے مقالے کے سلسلے کی ایک کتاب چھپ گئی ہے اور دوسری تیار ہے ایک اور بڑا کام کر رہا ہوں یہ ایک طرح سے افسانے کی تاریخ بن جائے گی۔

۱۴س:۔ کیا ادب میں نظریے کا عمل دخل ضروری ہے؟

ج:۔ میں تو اس معاملے میں خاصا متعصب آدمی ہوں۔ میں نہ صرف خود اس پر عمل کرتا ہوں بلکہ اس کی تبلیغ بھی کرتا ہوں۔ اصل میں قصہ یہ ہے کہ نظریہ ہر شخص کے ہاں کسی نہ کسی سطح پر موجود ہوتا ہے بعض لوگ اچھے دوستوں اور مطالعے کی وجہ سے ایک نظریہ سے تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ نظریہ ان کی شخصیت کا جزو نہیں بنتا۔ نظریے کے بارے میں ان کی باتیں [illegible] سی لگتی ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جن کی شخصیت میں [illegible] نظریے کی نمود ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ تخلیقی صلاحیت کا عاری ہونے [illegible] نظریہ ساز شخصیت کہوں گا۔ بطور نظریہ ساز تو اہم ہیں مگر

سندھی ادیبوں سے مل کر یوں لگا جیسے ہم طفلِ مکتب ہوں

بطور شاعر اہم نہیں ہیں۔ جن لوگوں کے پاس تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے۔ اُن کے ہاں نظریئے کی تبلیغ پر پروپیگنڈے کا گمان نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں وہ چیز خود بخود آرٹ کے پردے سے ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

۱۵۔س:۔ پچھلے گیارہ سالہ دور میں مزاحمتی رفتار کیا رہی۔ خصوصاً افسانے کے حوالے سے؟

ج:۔ اس گیارہ سالہ عرصے میں اگر آپ غور کریں تو جہاں اچھا لکھا گیا، جہاں بہت سی کتابیں اللہ نام سامنے آئے تو وہ افسانہ ہی ہے۔ فخر الاسلام، رشید احمد، مسعود اشعر، انتظار حسین کا ایک اپنا سٹائل ہے میں اُسے بھی مزاحمت میں لیتا ہوں۔ زاہدہ حنا، سمیع آہوجہ، احمد داؤد، منشا یاد، اعجاز راہی وغیرہ جیسے بڑے نام بھی اس دور میں ابھر کر سامنے آئے۔ اس سلسلے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ وہ مزاحمتی ادب اپنے اندر زیادہ شدت رکھتا ہے۔ جو مادری زبان میں لکھا جائے یا پھر اس کی جڑیں اپنی دھرتی میں موجود ہوں۔ امر جلیل، منشا یاد، یا اعجاز راہی کے افسانے پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ ایک خاص زمین پہ ہو رہا ہے اس میں صرف انسان ہی نہیں تڑپ رہا۔ بلکہ کلچر بھی مسخ ہو رہا ہے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے پوری بستی آسیب تلے ہے۔ اسی دور میں لوگ تصوف کی طرف گئے۔ انھیں لگا کہ مولوی کے مقابلے میں صوفی زیادہ انسان دوست ہے صوفی دوستی کے حوالے سے مذہب کو ایک تخلیقی تجربہ بناتا ہے۔ اسے تشدد یا تذلیل کا ہتھیار نہیں بناتا۔ اور پھر سچا صوفی، درباروں سے بھی اکتا دیتا ہے یہ رجحان ہمارے لٹریچر اور خصوصاً افسانے میں پیدا ہوا اسی دور میں فیض اور منٹو کو بھی دوبارہ دریافت کیا گیا یعنی لوگوں نے اس دور میں منٹو کے افسانوں "اللہ کا بڑا فضل" یا "ٹوبہ ٹیک سنگھ" پڑھے تو انھیں لگا کہ جیسے یہ افسانے ۱۹۸۰ء میں لکھے گئے ہیں۔ اسی فیض کے کلام میں جب لوگوں نے "نثار میں تیری گلیوں پر" جیسی تخلیقات کو دوبارہ پڑھا تو انھیں لگا جیسے وہ اس عہد کا نوحہ ہو۔ اس طرح اس گیارہ سالہ جبر و استحصال کے دور میں پہلے سے موجود مزاحمتی چیزیں بھی RE-DISCOVER ہوئیں۔

۱۶۔ س ،۔ ہمارے مخصوص معاشی و معاشرتی سٹرکچر میں ایک ادیب سچائی اور مصلحت میں کیوں کر توازن رکھ سکتا ہے ؟

ج ،۔ ہمارے معاشرے میں ادیب کے حوالے سے ہمیں دو تین باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ ہمارے ہاں ہمہ وقتی ادیب کا تصور بہت کم ہے۔ شاعر یا ادیب ہمیشہ جز وقتی ہوتا ہے۔ اس کا اصل پیشہ یا ذریعہ آمدنی تو کوئی مزدوری یا کہیں ملازمت ہی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی تعداد کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے صرف ادب ہی کو اپنا زندگیوں کا اوڑھنا بچھونا بنایا ہو ایسے لوگ تو شاید مصلحت سے آزادی حاصل کریں۔ اگرچہ مجھے ایسے لوگوں کے بارے میں بھی شک ہے۔ کیوں کہ جن اداروں کے لئے یہ لکھیں گے یا جس پبلشر سے ان کا رابطہ ہو گا۔ اس کی کئی باتوں کے سلسلے میں بھی انہیں مصالحتی رویہ اختیار کرنا پڑتا ہو گا۔ جہاں تک جُز وقتی ادیبوں کا تعلق ہے، تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ان کی نفسیات کیا ہو گی۔ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے ان کے لئے کچھ موضوعات تو سرے ہی سے ممنوع ہو جاتے ہیں۔ وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان مسائل پر سمجھوتہ کریں۔ مولوی تو ایسی باتوں پر راضی بہ رضا کے تصور سے کام چلا لیتا ہے۔ لیکن میری اپنی یہ خواہش ہے کہ کم از کم ادب، شعر اس قسم کی مصلحت سے پاک ہونے چاہئیں۔

۱۷۔ س :۔ ادیب کا اصل منصب کیا ہے؟

ج :۔ ادیب کا منصب اس وقت تک متعین نہیں کیا جا سکتا جب تک ہم اسے ایک باشعور شخص نہ مان لیں۔ میرے نزدیک ہر ادیب اور شاعر جو باشعور بھی ہو اپنے ذہن میں زندگی کا ایک خواب ضرور رکھتا ہے۔ زندگی کو خوبصورت بنانے کا خواب اور یہاں سے خوبصورت کا مطلب یہ ہے کہ جہالت، توہم پرستی، غلامی، مفلسی جیسی بدصورتی نہ ہو۔ جس کا یہ خواب ہے وہ اس کی تعبیر کے لئے کوشش بھی کرتا ہے میرے نزدیک ادیب و شاعر کا سب سے اہم کردار یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ذہنوں میں اس خوبصورتی اور بدصورتی کے تصور کو اُجاگر کرے، اُنھیں بتائے کہ ان کی محرومیاں خالق کی پیدا کردہ نہیں بلکہ عدل و انصاف کو مسخ کرنے والے لوگوں کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ کردار وہ اپنی تخلیقات، اپنی شاعری، افسانے، ناول وغیرہ کے ذریعہ ادا کرتا ہے۔

کسی بھی فن کار کی زندگی اس کا فن ہوتا ہے

س :۔ لاہور میں جمہوریت پسند مصنفین کی کانفرنس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔

ج :۔ اصل میں قصہ یہ ہے کہ لاہور کانفرنس ہمارے چند ایسے دوستوں نے کی تھی جو سمجھتے تھے کہ ادیب، شاعر اپنے ذہنوں میں انقلاب کا نقشہ یا رومانی انداز میں جو انقلابی تصورات رکھتے ہیں وہ اپنی جگہ پُرکشش ہیں لیکن پاکستان کے معروض حالات کا تقاضا کچھ اور ہے اور اس کا لب لباب یہ ہے کہ اگر ہم معاشرے میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو عوام کی منشا و حمایت بھی حاصل کریں اور اس سلسلے میں اُن جمہوری اداروں کو مضبوط بنائیں جو ایک طویل جدوجہد کے بعد قائم ہوتے ہیں کیوں کہ جو صدیوں کی غلامی کے لبادے کو اتار پھینکنے اور تذلیل و تشدد کی سیاہ رات مسلط کرنے والوں سے نجات کے خواہاں ہیں، وہ اپنی اس خواہش کو اچھے اداروں کے ذریعے شرمندۂ حقیقت کر سکتے ہیں لیکن کچھ لوگ کہیں کہ یہ انقلاب کا راستہ نہیں ہے کیوں کہ بہر حال اس میں ایک ارتقائی عمل آ جاتا ہے۔ تاہم یہ اُن کی خواہش تھی اور اس میں شریک ہو کر ہم سب کو بہت خوشی ہوئی۔ خاص طور مجھے تو خوشی اس لئے ہوئی کہ وہاں اُن سندھی ادیبوں سے ملنے اور ان کے خیالات سننے کا موقع ملا، جن کی تخلیقات سے میں یکسر ناواقف تھا، ہم نے قومی پیمانے پر ان کے نام کبھی نہیں سنے۔ نہ ہی ہمارے ذرائع ابلاغ نے ان کے نام کبھی نشر کئے لیکن جب وہ بول رہے تھے تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہم سب ان کے سامنے طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں ہم ناخواندہ ہیں اور ہمارا تجربہ کوئی تجربہ نہیں۔ ان لوگوں کے ہاں جو طنز، جس مزاح، تخلیق اپج اور جملہ بندی تھی اس سے یہ فرق صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ حقیقی معنوں میں ادب کا مطالعہ کوئی اور چیز ہے اور مدارس، مکاتب اور ڈگریوں کے بعد ادب کی تربیت حاصل کرنا ایک اور بات ہے۔ یوں سمجھئے کہ وہاں سندھیوں کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں سے ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہاں زندگی کا حقیقی تجربہ بول رہا ہے جسے سُن کر ہم سب بہت انسپائر ہوئے۔

۲۱۔ س :۔ کیا پبلک ڈیلینگ کے ذریعے بڑا ادیب بنا جا سکتا ہے ؟

ج :۔ میں ہمیشہ ادب کے طالب علموں کو کہتا ہوں کہ وہ غلام عباس کی مثال سامنے رکھیں۔ اُردو کے اس عظیم افسانہ نگار پر اس کی زندگی میں کوئی مضمون لکھا گیا، نہ کسی رسالے نے کوئی نمبر نکالا لیکن اس کے باوجود یہ افسانہ نگار پچاس برس تک زندہ رہا۔ آج بھی میں یہ کہتا ہوں کہ اردو کے دو بڑے افسانہ نگاروں میں سے ایک غلام عباس ہے۔ غلام عباس کو زندہ رکھنے والی چیز اس کا فن ہے اور کسی بھی فنکار کی اصل زندگی کا سبب اس کا فن ہی ہوتا ہے۔ غلام عباس کو کوئی سو برس بعد بھی پڑھے گا تو اُسے وہی تازگی محسوس ہوگی جو آج ہوتی ہے۔

۲۲۔ س :۔ ادب میں مذہبی اخلاقیات کی ضرورت ہوتی ہے یا انسانی اخلاقیات کی ؟

ج : میں ان دونوں کو جُدا نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک ہر سچے مذہب کا جوہر احترام انسانیت ہی ہوتا ہے۔ جو مذہب انسانی اقدار کا دشمن ہے یا وہ مذہبی آدمی جو انسان دوست نہیں ہے میں اسے مذہب یا مذہبی آدمی نہیں مانتا۔ یعنی جو تنگ دل ہے، انسان کا دشمن ہے، یا ہر وقت غصے میں رہتا ہے یا لوگوں کو خوفزدہ رکھتا ہے، لیکن اس شخص کو مذہبی و انسانی اخلاقیات سے عاری سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں ہر اچھا ادیب و شاعر اپنے آپ کو ایسی اقدار سے وابستہ کرتا ہے جو ہر سچے مذہب کی اقدار اور اُس کی اخلاقیات کی اساس ہیں کوئی شاعر یا ادیب یہ نہیں کہے گا کہ ظلم ہونا چاہئے یا جھوٹ بولنا چاہیے ہر بڑا ادیب و شاعر اس رویے کے خلاف مزاحمت کرتا ہے اور میرا خیال ہے ہر اچھے مذہب کی اخلاقیات بھی یہی کہتی ہے اس لئے میرے نزدیک ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔

۲۳۔ س :۔ فیض صاحب کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

ج :۔ فیض صاحب کے فن کے بارے میں بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں ان کی شاعری اُن کے تراجم اُن کا انداز اپنی جگہ ! لیکن میں ان کی شخصیت سے متاثر ہوں۔ دو تین مواقع ایسے آئے جب ہم نے انہیں قریب سے دیکھا ان پر بہت سے لوگ تہمتیں لگاتے تھے۔ ایک محفل میں میں نے ان سے تہمت کے حوالے سے سوال کیا میرا خیال تھا وہ غصے میں آ کر حفیظ جالندھری کے خلاف کچھ باتیں کریں گے اور جو طالب علمانہ لطف ہے وہ آئے گا لیکن انھوں نے صرف اتنا کہا کہ وہ بزرگ ہو گئے ہیں۔ اس

میں یادداشت دھندلا جاتی ہے۔ فیض صاحب کا یہی عمل ان کی شخصیت کا سب سے بڑا کرشمہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہر بڑے آدمی کی پہچان اُس کا تحمل ہوتا ہے یہی اس کی عالی ظرفی ہوتی ہے فیض صاحب کی زندگی کا ایک مخصوص سٹائل تھا جو بہت مثالی اور منفرد تھا۔

س :۔ شعبہ اُردو کو کیسا دیکھنا چاہتے ہیں؟

ج :۔ میری خواہش ہے جو بھی ہمارے طالب علم یہاں آئیں وہ نہ صرف اُردو ادب سے واقف ہوں۔ ادب کی تاریخ سے واقف ہوں بلکہ اُن کے دل میں انسانی اقدار کا احترام ہو۔ وہ وہ زندگی میں جہاں بھی جائیں وہ اگر ظلم دیکھیں جھوٹ کی حکمرانی دیکھیں اگر وہ لوگوں کو جاہل دیکھیں وہ خود بخود یہ سمجھیں کہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف مزاحمت کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صرف مزاحمت نہ کریں بلکہ بہت سے لوگوں کے دکھوں میں شریک ہوں۔ دلجوئی کریں۔ اس کے لئے وقت بہت کم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اپنے دکھڑے ختم نہیں ہوتے دوسروں کی کون سُنے"۔ جتنا ہو سکے دل کے قریب آنا یا دردمند کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔

آخری بات یہ ہے کہ قابل فخر بات یہ ہے کہ شاگرد ترقی کریں اور آگے بڑھیں۔ یہاں سے جو لوگ گئے ہیں جب اُن کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ بہت اچھا اُستاد ہے اور وہ ہمارا شاگرد ہے تو جو خوشی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ اسی طرح اس کی کوئی ہو تو ہم چاہتے ہیں کہ جتنا ہو سکے بہتر کرے ہم مثالی اُستاد بنیں مگر مثالی ماحول نہیں ملا۔

یونیورسٹی میں اردو ادب کے بارے میں سوتیلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ تنقید میں۔ ادب کے بارے میں انتظامیہ کہتی ہے کہ مڈل ہجر کے لوگ زیادہ بولتے ہیں۔ سوال اٹھاتے ہیں زیادہ مسائل پیدا کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود میں سمجھتا ہوں ہمارا شعبہ بہت اچھا رہا ہے لیکن اس کو اور اچھا ہونا چاہئے اور اچھے کا مطلب ہے کہ جہاں جائیں سرخرو ہوں۔ لوگ اچھے استاد لیکن اچھے منتظم بھی اور تنقیدی تخلیقی شعور رکھتے ہوں۔

پسندیدہ شعر :۔ قامت وگیسو میں قیس وکوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

فیض رنگ
مضامین :
انٹرویوز :
فیض کی نذر :
منتخب کلام :
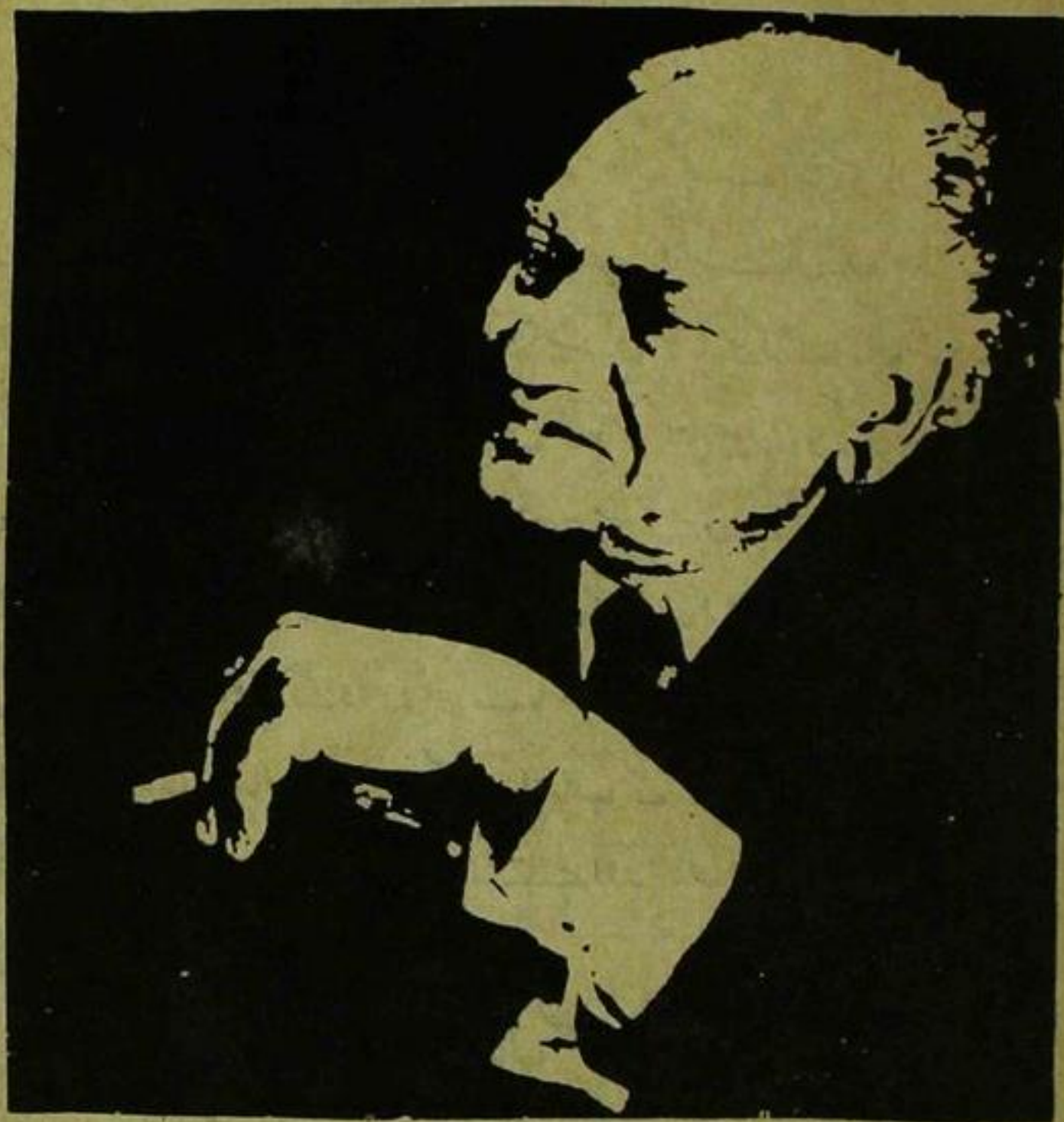
دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

فیض احمد فیض

یہ مقالہ فیض کی زندگی میں لکھا گیا۔

بیگم ایلس فیض
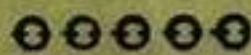
"کیا تم اپنے شوہر کی شاعری سمجھ لیتی ہو؟" یہ سوال مجھ سے اکثر کیا گیا ... میں نے کافی غور و خوض کے بعد اس کا ایک ایسا جواب ڈھونڈ لیا ہے جو میرے خیال میں صداقت پر مبنی ہے اور حرفِ آخر کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ میں ان کی شاعری کو سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کرتی لیکن یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں شاعر کو سمجھتی ہوں۔ اور کسی شاعر کی شخصیت ہی اُس کی شاعری کا سرچشمہ اور اس کے وجدان کی قوت متحرکہ ہوتی ہے مگر میں اس مضمون میں ان کی شخصیت کی صورت گری کی کوشش نہیں کروں گی کیوں کہ اس کے لیے ان اقلیموں کو طے کرنا پڑے گا جو ایک بیوی کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ بلکہ میں ایک شاعر کے گھر کی زندگی کا خاکہ پیش کروں گی جہاں وہ اپنے اعزا اور احباب کے جمگھٹے میں ہوتا ہے جس کے کسی گوشۂ تنہائی میں وہ جسمانی اور ذہنی تکان دور کرتا ہے اور جہاں وہ کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر شعر کی تخلیق کرتا ہے۔

میں نے لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ فلاں شخص کا مزاج عجیب وغریب سہی، اس کے اطوار دنیا جہان سے نرالے ہیں، تو کیا ہوا۔ وہ بہر صورت ایک فنکار ہے۔ اس کی تلون مزاجی اسکی بوقلمونیت اور اس کے لاابالی پن کو صرف اس لیے قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ فنکار ہے۔ اسے کسی حد تک خود فراموشی تساہل، تن آسانی اور بعض دینوی فرائض سے گریز کرنے کی اجازت ہوتی ہے بالخصوص اگر وہ فرائض ایسے ہوں جنھیں ادا کرنے کے لیے ہاتھ پیر ہلانے کی بھی ضرورت ہو۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ عام لوگوں کے مقابلے میں فنکار زیادہ خود فراموش کیوں ہوتا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اُس کا ذہن ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ بہرصورت یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ فنکار کی بعض کوتاہیوں سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا رہتا ہے اور اس سے بھی انکار

نوٹ کیا جا سکتا کہ اسے ایک حد تک قابلِ معافی سمجھنا چاہیے۔ وہ لوگوں سے ملنے کے وعدے
کرکے بھول جاتا ہے اور پین کے لیے سارا گھر چھان مارتا ہے لیکن ممکن ہے وہ اس کی جیب ہی میں
موجود ہو۔ اس کا فونٹین پن ہمیشہ چوری ہو جاتا ہے۔ اس کے اعزا و اقربا کو طوعاً و کرہاً یہ تمام
باتیں برداشت کرنا ہوتی ہیں بلکہ دن بھر کی مسلسل الجھنوں کا نتیجہ کسی نظم، کسی شبیہ یا تصویر
یا کسی اور شاہکار کی شکل میں ظاہر ہو جائے تو انھیں اپنی قسمت پر شاکر ہونا چاہیے۔

کئی سال ادھر کی بات ہے کہ مجھے ایک کوٹ کی گمشدگی کا پہلا تجربہ ہوا۔ ہماری نئی نئی
شادی ہوئی تھی اور ہماری آمدنی بہت کم تھی۔ جنگ چھڑ چکی تھی اور قیمتیں تیزی سے چڑھ
رہی تھیں۔ میں ہندوستان میں تھی اور میرے والدین انگلستان میں۔ اسی لیے ان سے بھی
ہمیں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ پھر تنخواہ بھی اتنی ہی تھی جتنی جنگ سے پہلے ملتی تھی۔ ہمیں
شادی یا فنکار کی ان کمزوریوں کے لیے کوئی الاؤنس بھی نہیں ملتا تھا جنھیں وہ اپنا حق تصور
کرتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے ایک سوٹ بنوا ہی ڈالا۔ نیا سوٹ بنوانا اس زمانے میں ایک
عیاشی سے کم نہ تھا۔ فیض اسے لینے کے لیے امرتسر گئے۔ اور رات گئے لاہور واپس آئے۔
ان دنوں ہم نہر کے قریب ایک دور دراز اور الگ تھلگ مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت کوئی
تانگے والا وہاں تک جانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک تانگے والا اس پر راضی
ہو گیا کہ وہ انھیں کچھ دور تک پہنچا دے گا۔ تانگے والے نے فیض کو جس جگہ اتار دیا وہاں سے
ہمارا گھر تقریباً ایک میل تھا اور انھیں یہ مسافت پیدل طے کرنی پڑی۔ قیمتی بنڈل ان کی
بغل میں دبا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر فیض نے مجھے جگایا اور میں نے بنڈل ان سے لے لیا لیکن اسے
ہاتھ میں لیتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیونکہ اس میں ایک گرم سوٹ ہونے کے باوجود بنڈل بہت
ہلکا تھا۔ بنڈل کا ایک کنارہ کھلا ہوا تھا اور کوٹ ندارد تھا۔ فیض نے کہا کہ رات بہت ہو گئی ہے اب اسے
صبح تلاش کروں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ جہاں تانگے والے نے مجھے اتارا تھا وہاں سے گھر تک آنے
ہی میں کوٹ کہیں گر گیا ہے۔ لیکن تھوڑی سی بحث کے بعد جو ایک حد تک یک طرفہ تھی یہ طے پا گیا کہ
نہ تاریخ ہے کہ اسی وقت کوٹ تلاش کرنے چلے جائیں۔ لیکن ان کی تلاشِ نیم شبی کے باوجود کوٹ

نہ ملا۔ پتلون البتہ میرے پاس کئی سال تک اور جوں کی توں رکھی رہی اسے کسی نے استعمال نہیں کیا اور ہماری ازدواجی زندگی کے پہلے اسراف کی یاد تازہ کرتی رہی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے سیلاب کے بعد یہ نشانی میرے پاس باقی نہ رہی۔ اسے ایک مستحق کو دے دیا گیا۔

چند مہینے بعد کپڑوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس گم ہو گیا تو میں نے کسی ناگواری کا اظہار تک نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں کراچی جاتے ہوئے فیضؔ کا بستر ایک اور مسافر سے بدل گیا تو میری قوتِ برداشت قریب قریب ختم ہو گئی۔ بستر کھولنے پر مجھے اس میں جو گدا ملا وہ اس گدے سے بہت اچھا تھا جو کہیں اور چلا گیا تھا لیکن مجھے اپنی جگہ پر کچھ ندامت اور کچھ پریشانی سی تھی کہ اس بستر کے مالک نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا۔

بعض اوقات میرا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ لااُبالی پن اُن کی طبعی فراخدلی اور بے نیازی کی غمازی کرتا ہے اور انہیں کسی چیز کی افادی قدر و قیمت کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس سے صرف ان کی کتابیں ضرور مستثنیٰ ہیں۔ جنہیں وہ بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور انھیں اس طرح سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ جیسے کوئی بندۂ زر اور بخیل اپنے مال و دولت پر جان نچھاور کر... لیکن کوئی شخص اُن سے کوئی کتاب مانگتا ہے تو اُن سے انکار بھی بن نہیں پڑتا۔ جب میں اُن سے پوچھتی ہوں کہ تم نے بلا سوچے سمجھے کتاب کیوں دے دی۔ معلوم نہیں اب وہ واپس ملے گی یا نہیں، تو وہ متانت اور برجستگی سے جواب دیتے ہیں ... تک کوئی اس کتاب کو پڑھتا رہے گا اسے ذ... دینے کا خطرہ مول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں"

۱۹۴۷ء میں میرے تمام زیورات چوری ہو گئے۔ میری خوش دامن نے مجھے کچھ چھوٹے چھوٹے لیکن پر تکلّف زیور دیے تھے۔ چند چیزیں میں نے خود بھی خریدی تھیں۔ چور وہ سب لے گئے۔ میرے اپنے گھر میں یہ پہلی چوری تھی۔ پولیس کی مدد سے بھی ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور ہم یہ سوچ کر بیٹھ رہے کہ جانے والی چیز کا غم ہی کیا۔ میرے چہرے پر احساسِ محرومی کی جھلک دیکھ کر فیضؔ کہنے لگے۔ تم نے شاعر کا یہ مصرع نہیں سنا۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔ اور میں اچانک یہ محسوس کرنے لگی کہ میرے احساسِ محرومی میں ایک طرح کا احساسِ مخلصی

بھی شامل ہو گیا ہے۔ ان دونوں شاعروں سے میری اپنی رائے بھی زیادہ مختلف نہیں تھی۔

میرا قیاس آہستہ آہستہ یقین کی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ ہماری بڑی بچی سلیمہ بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے اور اُن سے کافی مماثل بھی ہے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جو لوگ بڑی فراخدلی سے اپنی اچھی سے اچھی چیز دوسروں کو اُٹھا کر دے دیتے ہیں یا کسی چیز کی گم شدگی پر ذرا بھی ملول نہیں ہوتے بلکہ جن کے لیے احساسِ محرومی بھی لذت بخش بن جاتا ہے اُن کی معیشت انتہائی مسرت افزا، اُن کی شخصیت انتہائی دلپذیر اور اُن کی رفاقت ہمیشہ تفننِ طبع ہوتی ہے۔

ان خامیوں یا خصوصیتوں کا توڑ کرنے کے لیے خوش قسمتی سے مجھ میں ایک طرح کی ملکیت پسندی پیدا ہو گئی ہے اور کبھی کبھی کوئی ایسی چیز بھی واپس لے لیتی ہوں جس کی واپسی کی کوئی اُمید نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمارے پاس بھی تو کچھ ہونا چاہیے ورنہ ہم دوسروں کو دیں گے کیا؟ منیزہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ حقیقت پسند ہے اور ہر چیز کا باقاعدہ حساب رکھتی ہے وہ بہت چھوٹی سی تھی لیکن کتابیں پڑھنے اور تصویریں دیکھنے کی حد سے زیادہ شوقین تھی ایک دن اس نے اپنی باجی کی کتاب اُٹھاتے ہوئے پوچھا "باجی۔ میں آپ کی کتاب دیکھ لوں؟" سلیمہ کو بھی اپنی کتابیں بہت عزیز ہیں۔ اس نے جواب دیا "نہیں تم خود اپنی کیوں نہیں دیکھتیں۔" "باجی! اپنی کتاب بہت زیادہ دیکھوں گی تو وہ گھس جائے گی۔" منیزہ نے جواب دیا۔ فیض کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گھر میں کوئی تو ایسا بھی ہونا چاہیے۔"

ظاہر ہے کہ فیاض اور فراخدل آدمی انسانوں کے ہجوم اور ان کی معیت کو بھی بہت پسند کرتے ہیں۔ عید، ہولی، بسنت اور دوسرے تیوہاروں پر سیر و تفریح کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر فیض خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ وہ ان کا دور سے تماشہ نہیں دیکھتے بلکہ ان کی رنگ رلیوں میں خود بھی حصہ لیتے ہیں۔ اپنی خاموشی اور کم آمیزی کے باوجود ——— اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ ذہنی یکسوئی، ایک پرسکون گھریلو زندگی اور عزلت

گزینی کے متمنی رہے ہیں۔

ہمارے گھر کے معمولات بچوں کے نظامِ اوقات کے تابع ہیں اور فیض نے اسے بے چون وچرا قبول کر لیا ہے تاکہ بچوں کی باقاعدہ زندگی میں کوئی خلل نہ پڑے یا انھیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو۔ ممّی کا ہر قول، بچوں کے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف کسی اور عدالت میں اپیل ممکن نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اگر انہیں بہت چھوٹی سی کہانی سنائی جائے یا بچّے کہتے رہ جائیں کہ ہم نے ابّا جان کو دن بھر سے نہیں دیکھا انہیں آجانے دیجئے لیکن اگر ممّی یہ کہہ دیں کہ نہیں اب سو جاؤ تو ان میں سرتابی کی مجال نہیں۔ بچوں کی پرورش و پرداخت کے معاملے سے اپنی لاعلمی کا اعتراف خود فیض کو بھی ہے اور وہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ کام میرے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔

جون ۱۹۵۲ء میں فیض جب حیدرآباد جیل میں تھے تو میں نے انہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ "ان بچیوں کی بیک وقت ماں اور باپ کے فرائض انجام دینا میرے لیے کتنا مشکل ہے"۔ اس کے جواب میں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ "میری بچیوں کو تم سے اچھی ماں نہیں مل سکتی۔ کتنی خوش نصیب ہیں وہ"۔ ان کی تعلیم و تربیت سے فیض کی بے تعلقی کے باوجود بچیاں فیض سے بالکل نہیں ڈرتیں بلکہ باپ بیٹیوں نے ایک دوسرے کے عجیب و غریب اور بڑے دلچسپ نام رکھ چھوڑے ہیں۔ اُن کے مقدمے کے دوران میں ہمارے وکیل صاحبزادہ نوازش علی خاں مرحوم نے ایک بار جیل جاتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم نے فیض کے نام عید کے تار میں جن کبوتروں کا ذکر کیا تھا، وہ کون ہیں۔ اور میں نے دونوں بچیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو میرے سامنے اسی وکٹوریا پر بیٹھی تھیں کہا "وہ کیا بیٹھی ہوئی ہیں"۔

منیزہ نو مہینے کی جدائی کے بعد جب اپنے والد سے پہلی بار جیل میں ملی اس وقت اس کی عمر صرف ساڑھے چار سال تھی۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "ابّا جان آپ تو بالکل بوڑھے ہوگئے میں تو سمجھتی تھی کہ آپ کی عمر بہت کم ہے اور آپ بڑے خوبصورت ہوں گے ارے آپ کے تو بال سفید ہوگئے"۔ لیکن ان کی گود میں پہنچتے ہی جیسے وہ بالکل بدل

گئی اور اس نے کہنا شروع کیا۔ "آپ گھر نہیں چلیں گے ابّا جان۔ امّی مجھے مارتی ہیں"
یہ سن کر جیسے میری اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔ کیونکہ بچوں کو مارنا
ہمارے خاندان میں قریب قریب بالکل منع ہے۔ لیکن فوراً ہی میں نے محسوس کیا
یہ شکایت بڑی بے معنی ہے اور وہ دراصل کہنا چاہتی ہے کہ گھر میں ان کی کمی شدت سے محسوس کیجاتی ہے۔
منیزہ انھیں ہر خط میں یہ ضرور لکھتی ہے کہ دیکھیے میرا خط کسی اور کو نہ دکھایئے گا
لیکن اسے کیا معلوم کہ ان کے نام جتنے خط جاتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ کو سینسر
بڑے غور سے پڑھتا ہے۔ پچھلے سال ایک بار منٹگمری جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ
مسٹر لودی کی تو شامت ہی آگئی۔ بے چارے نے کہیں اس سے یہ کہہ دیا کہ تم نے اپنے
ابّا جان کو جو خط لکھے ہیں، وہ مجھے بہت پسند آئے۔ یہ سنتے ہی منیزہ غصے سے سُرخ
ہو گئی اور اُن پر برس پڑی، چھوٹی بچّی بڑی لڑاکا، جلبلی اور زود حس ہے، غصّہ تو اس
کی ناک پر رکھا رہتا ہے۔ لیکن وہ محبت کا ایک ننھا سا مجسمہ بھی ہے۔ اس میں صبر و تحمل
کی ضرور کمی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑی دلچسپ اور باغ و بہار ہے۔ ہم میں ہمت
ہوتی تو غالباً ہم سب اسی کی طرح بن جانا چاہتے۔ اس میں اپنے والد کا بے پایاں صبر و تحمل
نہیں، نہ وہ اپنی بڑی بہن کی طرح متین اور سلیم الطبع ہے۔ بلکہ بعض رشتے والیاں تو
یہ کہتی ہیں کہ یہ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ لیکن میری رائے میں اسکی تصدیق تو اسکی نانی اماں ہی کر سکتی ہیں۔
بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ تو اُردو بڑی اچھی بول لیتی ہیں۔ شاید یہ فیض
کا اثر ہے۔ حقیقت اس کے برعکس نہ سہی مگر اس سے مختلف ضرور ہے۔ زبانیں، میں
کچھ فطری طور پر آسانی سے سیکھ لیتی ہوں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم
جس ماحول میں رہتے ہیں وہ ادبی اور بول چال کی زبان سیکھنے کے لیے انتہائی سازگار
ہے جہاں تک بچیوں کا تعلق ہے، فیض کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اُردو ہی
کو اپنائیں وہ اکثر کہتے ہیں کہ بچیاں میری ۔ خوشدامنی زبان ،، تو بہر صورت سیکھ لیں گی
اور ان کی ماں اسے سکھانے کے لیے کافی ہے لیکن اب اپنی زبان پر عبور حاصل کرنے

کی ضرورت تیزی سے بڑھتی جارہی ہے جس وقت تمام گھر والے بیٹھے ہوتے ہیں اور آپس میں باتیں ہوتی ہیں تو بچیاں کبھی ایک زبان بولتی ہیں کبھی دوسری۔ وہ مجھ سے انگریزی میں اور فیض سے اُردو میں باتیں کرتی ہیں اس لیے کسی خاص کوشش کے بغیر وہ دونوں زبانیں بولنے لگی ہیں

بعض دوست مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تم نے کبھی فیض کو غصے کے عالم میں بھی دیکھا ہے فیض اپنی نرم مزاجی کے لیے مشہور ہیں اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ غصہ انھیں کبھی آتا ہی نہیں۔ میں اپنے دوستوں کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ گھریلو زندگی میں بھی انھوں نے کبھی کسی آبگینے کو ٹھیس نہیں لگائی یہ ابرجواب سن کر ایک بار ایک دوست نے بڑی نیک نیتی سے کہا تھا کہ جنگ کے بعد ملاپ میں جو مزہ ملتا ہے اس کی لذت سے تم محروم ہو۔ یہ درست ہے کہ ہم اس سے محروم رہے ہیں جسے معلوم نہیں مسرت کہا بھی جاسکتا ہے یا نہیں لیکن اس کرب اور کوفت سے ہم یقیناً محفوظ رہے ہیں جو برافروختگی یا جلد بازی کے عالم میں کوئی بات کہہ جانے میں اس پر متاسف ہونے سے ہوتی ہے ہم اپنے اختلافات پر باتیں ضرور کرتے ہیں لیکن بات اس سے آگے کبھی بڑھنے ہی نہیں پاتی اور آخرکار ہم اختلافات رائے ہی پر متفق ہوجاتے ہیں۔

ہماری خانگی زندگی کے ایک پہلو پر ایک بار جوش صاحب نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں وہ دلی آئے۔ اس سے پہلے ان سے سری نگر میں ہماری شادی کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی لیکن عقد کے بعد ہی ایک مشاعرہ شروع ہوگیا جس میں انھوں نے اور مجاز نے خوب خوب کلام سنایا۔ اس لیے باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور اسے بعد کے لیے اُٹھا رکھا گیا۔ دلی میں ملاقات ہونے پر انھوں نے مجھ سے سوال کیا "آپ میں اور فیض میں لڑائی بھی ہوتی ہے یا نہیں؟" میرا جواب نفی میں سن کر انھوں نے افسوس کے ساتھ اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے یہ؟" انھوں نے اپنا جملہ پھر دہرایا لیکن ان کی آنکھوں میں تمسخر جھلک رہا تھا "یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ پھر آپ لوگوں میں محبت کیسے ہوسکتی ہے؟" میں نہیں کہہ سکتی کہ جوش صاحب نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا

لیکن میں آج تک ان سے اتفاق رائے نہیں کر سکی۔

ہماری ازدواجی زندگی کے دوران میں دکھ درد اور رنج وملال کے مواقع بھی آئے ہیں۔ میں نے فیض کو ایک پیاری بہن، ایک بھائی اور بہت سے عزیز اور محبوب دوستوں سے محروم ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن وہ جیسے ان غموں کو برداشت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کی جبین کبھی شکن آلود نہیں ہوتی۔ ان میں سے ایک ایسا تحمل اور ایک ایسی رجائیت پیدا ہو گئی ہے جو محض موضوعی نہیں ہے بلکہ ان کا فلسفۂ حیات اور ان کی امیدیں اس کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کی فطری شرافت پر ان کا عقیدہ بہت راسخ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ناسازگار حالات میں مسخ ہو جاتی ہے لیکن اس کا وجود کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی فطرت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس کی خامیوں ہی پر کیوں انگشت نمائی کریں ہم اس کی خوبیوں کی بات کیوں نہ کریں یا انہیں اپنا موضوعِ سخن کیوں نہ بنائیں۔

گزشتہ ساڑھے تین سال میں انھوں نے مجھے بارہا لکھا ہے کہ بچیوں کو خوش رکھو اور انہیں سکھ پہنچاؤ۔ انہیں رنج وغم سے روشناس کرنے کے لیے کافی وقت پڑا ہے اور بچیاں بھی اپنی تمام پہیلیاں، لطیفے اور پر مذاق کہانیاں اپنے والد سے ملاقات کے لیے اٹھا رکھتی ہیں۔ ان کی باتیں سن کر اکثر سنگدل اور ترش رو وارڈر بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکے۔ فیض نے غم کا ایک روشن اور اثباتی پہلو بھی تلاش کر لیا ہے یعنی غم کے باوجود حصولِ مسرت کے لیے مسلسل جد وجہد۔

ہمارے گھر میں اگر کسی کی سالگرہ ہو تو خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو تحفے دیے جاتے ہیں۔ مجھے ننھی سلیمہ کی پہلی سالگرہ کی تقریب ابھی تک اچھی طرح یاد ہے۔ فیض تہیہ کر چکے تھے کہ وہ اس کے لیے تحفے ضرور لائیں گے لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اتنے چھوٹے بچے کے قابل تحفوں کے انتخاب کے لیے صرف پدری محبت کافی نہیں ہے۔ اس زمانے میں ہم دہلی میں رہتے تھے۔ وہ اور مجید ملک خریداری کی مہم پر روانہ ہوئے اور

کناٹ پیلس سے واپس ہوئے تو بنڈلوں سے لدے ہوئے تھے۔ وہ بچوں کی ایک چھوٹی سی گاڑی، تصویروں کی ایک کتاب اور ایک ٹی سیٹ لے کر آئے تھے لیکن ایک بنڈل جو کھلا نہ تھا اور ہر شخص یہ دیکھنے کا مشتاق تھا کہ اس میں کیا ہے، انھوں نے بتایا کہ پارسل میں ایک ننھی منی خوبصورت سی گڑیا ہے جو گاڑی پر شان سے بیٹھ کر سیر کرے گی لیکن ان دونوں نے اس کی خریداری سے پہلے گڑیا کے کپڑے اتار کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کیونکہ جسے وہ گڑیا سمجھ کر خرید لائے تھے وہ دراصل ایک ٹی کوزی تھی جسے آخر کار آتش دان پر فروکش کر دیا گیا گاڑی پر سواری کے لیے ایک اور گڑیا خریدی گئی جو اتنی خوبصورت تو نہیں تھی لیکن تھی گڑیا ہی۔ انگلستان کے ہر خاندان میں سالگرہ کے موقع پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں لیکن پاکستان میں پیدائش کے اندراج اور ولادت کے سرٹیفکیٹ کے اندراج کا باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے عموماً یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ سالگرہ منائی کب جائے میں نے ایک بار اپنی خوشدامن سے فیضؔ کی تاریخِ ولادت معلوم کی کیونکہ میری رائے میں یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ سب کی تو سالگرہ منائی جائے لیکن صاحبِ خانہ ہی محروم رہے۔ اُن کا جواب بہت مبہم تھا۔ لیکن انتہائی دلچسپ تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کی ولادت کے وقت بارش ہو رہی تھی۔ مگر یہ کسی کو یاد نہیں کہ بارش گرمیوں میں ہو رہی تھی یا سردیوں میں یا بادل محض اتفاق سے گھر کر برسنے لگے تھے۔ بعد میں فیضؔ کے ایک ماموں نے ہماری مشکل حل کر دی انھیں صحیح تاریخ یاد تھی اور یہ وہی تاریخ تھی جو ان کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج ہے۔

میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان آنے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ میری روانگی سے چند ہی روز قبل لندن میں مسز تاثیر کا خط ملا جس میں انھوں نے ایک انتہائی عزیز دوست کے لیے بعض چیزیں منگائی تھیں اپنی مصروفیت کے باوجود میں ان فرمائشوں کی خریداری کے لیے آکسفرڈ سٹریٹ میں بھاگی پھری اور ان کے دوست کو بُرا بھلا کہتی رہی۔ نئی چیزوں کے لیے جگہ نکالنے کے لیے مجھے اپنا سامان کئی بار کھولنا باندھنا پڑا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا

کہ کچھ دن بعد یہی چیزیں میری اپنی گرہستی بن جائیں گی ۔ لیکن اس کا احساس مجھے اب ہوتا ہے کہ اس انتہائی عزیز دوست نے عین وقت پر جن چیزوں کی فرمائش کی تھی ان پر متعجب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔

اپنی شاعرانہ شہرت قائم رکھنے کے لیے ہر شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ برابر شعر کہتا رہے ۔ لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ شادی کے بعد فیض نے شاعری کیوں ترک کر دی ۔ لیکن یہ درست نہیں کہ فیض نے شاعری ترک کر دی تھی ۱۹۵۱ء تک وہ کبھی کبھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے اور اس دوران میں بھی انہوں نے بعض نظمیں اور غزلیں معرکۃ الآراکہی ہیں لیکن یہ درست ہے کہ انھوں نے زیادہ نہیں لکھا ۔ فیض اس کا جواب دیتے تھے کہ شاید اب میں بہت زیادہ آسودہ خاطر ہو گیا ہوں ۔ اور میری بہت زیادہ خبر گیری کی جاتی ہے لیکن اچھی شاعری کے لیے شاید تکلیف اور غم ضروری ہے ۔ "دست صبا" کی نظموں اور غزلوں کا محرک بھی ان کا غم ہی ہے لیکن یہ محض ان کا ذاتی غم نہیں بلکہ ایک وسیع تر غم ہے ۔ "دست صبا" کے متعلق انھوں نے جیل سے مجھے لکھا "یہ مجموعہ تمہارا ہے ۔"

جب آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں اور تیز ہوا چلنے لگتی ہے تو شاعر کی رگِ احساس بھی پھڑک اٹھتی ہے ۔ اس کی شاعری اس کے دل میں کروٹیں بدل کر بیدار ہو جاتی ہے اور وہ سوال کرتا ہے "کیا میں دن کا باقی حصہ باغ میں گزار سکتا ہوں ۔ ممکن ہے میں کوئی نظم کہنے میں کامیاب ہو جاؤں ۔" کئی گھنٹے بعد واپس آتے ہیں تو میں ان کی آہٹ سن کر اندازہ لگا لیتی ہوں کہ انہیں کامیابی ہوئی یا نہیں ۔ ان کے برعکس تاثیر مرحوم آمد کے وقت اپنی کشمیری شال اوڑھ کر بیٹھ جاتے کبھی دبی زبان سے کراہتے ، کبھی جھومنے لگتے اور پھر شعر ہو جاتا ۔

ہمارا عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ شاعر اور فن کار عجوبۂ روزگار اور دنیا زمانے سے نرالے ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ دوسرے انسانوں سے اس لیے مختلف ہوتے ہیں کہ ان کا مشغلہ خالص ذہنی ہوتا ہے اور ان کی عرق ریزی اور جگر کاوی کا نتیجہ ہر کس و ناکس کے لیے نہیں ہوتا اور اس سے ہر شخص محظوظ نہیں ہو سکتا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی ذمہ داری دراصل

ہمارے معاشرے پر ہے جو ایسے حالات پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن میں ہر شخص شاعری یا مصوری سے تو لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن شاعر یا فنکار کی ذات سے نہیں۔ فنکار کا مشغلہ چونکہ خالص ذہنی ہوتا ہے اس لیے وہ اس دنیا کی حدود سے نکل جاتا ہے، اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اپنے گھر بار اور روزمرّہ کی ضرورتوں کی پروا نہیں رہتی اسے ایسے رفیق کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کر سکیں یہ ہفت خواں اگر آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں تو شاعر، مصور یا مصنف اپنی دنیا میں کھو سکتا ہے اور اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ کارِ دنیا تمام ہو چکے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ مصنفوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی تصانیف کو اپنے دوستوں اور ان لوگوں کے نام معنون کرتی ہے جو انہیں عزیز ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہوتے تو ان کی تصنیف بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتی۔ اور مجھے یقین ہے کہ فیض نے "دستِ صبا" کا مسودہ بھیجتے وقت مجھے جب یہ لکھا تھا کہ "یہ تمہاری ہے" تو ان کا بھی یہی مطلب تھا۔

❋ ❋ ❋

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گی

فیض

ڈاکٹر قمر رئیس

فیض کے دو عشق

فیض کی شاعری عشق و محبت کے والہانہ جذبات سے معمور ہے۔ اس عشقیہ شاعری میں جہاں ہزار شیوہ حُسن کی رنگینیاں سانس لیتی ہیں، وہاں اس میں سوز و درد کی تیکھی لہریں بھی ہیں۔ کبھی یہ عشق لہو کی دھیمی دھیمی آنچ میں سُلگتا نظر آتا ہے تو کبھی سیلِ جنوں بن کر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتا ہے کبھی یہ ایک شخص کے تصوّر کی رعنائی خیال بن جاتا ہے اور کبھی ساری انسانیت، ساری کائنات پر محیط ہو جاتا ہے۔ الغرض فیض کی شاعری کے ہر دور میں محبت کا جذبہ ہی ان کی شاعری کا غالب محرک اور موضوع رہا ہے۔

فیض کی بیٹی منیزہ نے اپنے اَبّو کی سیرت کے ایک بنیادی پہلو کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> "ان کے جسم و جان میں میرے خیال میں خون کے بجائے محبت کا، پیار کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ وہ کہتے ہیں جتنا لوگوں کو پیار کرو گے' وہ اس سے بڑھ کر تمھیں پیار کریں گے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ زندگی کی کدورتیں محبت کے اس دریا میں ڈبو دوں جو مجھے اَبّو سے ملا ہے' اور پھر ساری انسانیت سے والہانہ پیار کروں۔"

اس آفاق گیر محبت کا جذبہ یوں تو خمیر کی طرح فیض کے وجود میں موجود تھا لیکن اس کا شعور اور ان کی شاعری میں اس کا اظہار آہستہ آہستہ ہی ہوا۔ جیسے جیسے اپنے وطن کے اور ساری دنیا کے دُکھی انسانوں سے اُن کا رشتہ مضبوط ہوتا گیا، جیسے جیسے اُن بے شمار دکھوں اور محرومیوں کے اسباب کو انھوں نے سمجھا اسی طرح' اُن کے دل میں ان کی محبت اور دردمندی کے

جذبات جگہ بناتے رہے اور اُن کے بے ساختہ اظہار سے ان کی شاعری میں بھی زیادہ وسعت گہرائی اور تاثیر پیدا ہوتی رہی لیکن اس کا ذکر ذرا بعد میں ان کے دوسرے عشق کے ذیل میں آئے گا۔ پہلے ہم ان کے اوّلین عشق کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کو وہ ہمیشہ چھپاتے رہے اگرچہ ان کی شاعری میں یہ عشق بلا تمیز، اشاروں کنایوں میں سہی ہمیشہ نمایاں رہا، اپنی نظم "دو عشق" میں انھوں نے پہلے عشق کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے۔

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیِ گلفام
وہ عکسِ رخِ یار سے لہکے ہوئے ایّام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا امّید کا ہنگام

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی، سینے میں لگی ہے
تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

سوال یہ ہے کہ یہ پہلا عشق کس حسینہ سے ہوا کیسے ہوا اور کس زمانے میں ہوا۔ ہمارے مشرقی آداب اور ہماری عشقیہ شاعری کی یہ روایت رہی ہے کہ اصل معشوق کا اتا پتہ نہیں بتاتے۔ وہ پردہ نشین ہو یا نہ ہو شاعر اسے پردہ میں ضرور رکھتا تھا۔ فیض نے یا ان کے کسی دوست نے بھی ان کے پہلے عشق کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا ہے، لیکن بعض اشاروں سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں ۳۲-۱۹۳۲ء میں جب

فیضؔ گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے تو پہلے عشق کا تیر ان کے سینے میں لگا تھا اور میر تقی میرؔ کے عشق کی طرح اس کا زخم اتنا کاری تھا کہ ساری زندگی مندمل نہ ہو سکا۔ قرائن سے ایسا لگتا ہے کہ یہ کسی بڑے اور باعزت گھرانے کی نہایت حسین دوشیزہ تھی۔ یوں تو اس حسنِ دلآرا کی سج دھج فیضؔ کی ہر دور کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے لیکن عنوانِ شباب کی ایک نظم میں اس کا سراپا انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے :-

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرّتیں پنہاں
وہ حُسن جس کی تمنّا میں جنّتیں پنہاں
شباب جس سے تخیّل پہ بجلیاں برسیں
وقار جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں
سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اِترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے
وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہار لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش
گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے

فیضؔ کے ایک بے تکلّف دوست ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیضؔ سے اپنی بے شمار ملاقاتوں اور مکالموں کی روداد اپنی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں لکھی ہے۔ ایک ملاقات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

"پنڈی کلب کے لان میں ایک خاموش شام تھی اور ہم تھے۔ میں اور فیضؔ . . . .

"فیضؔ صاحب۔ آپ نے کبھی محبت کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کی ہے اور کئی بار کی ہے ـــــ" یہ کہہ کر پھر چپ ہو گئے۔

"سیریس (Serious) محبت ؟" میں نے پوچھا۔

بولے "ہاں ہاں، تمہارا مطلب پہلی محبت سے ہے نا۔ محبت پہلی ہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ہیرا پھیری ہے۔ اچھا شعر سن لو۔ آج صبح سے شعر آرہے ہیں۔ یہ دفتری کام انسان کے بھیجے سے عقل غائب کر دیتا ہے اور فائل گھسیٹر دیتا ہے۔ شعروں کے بعد ان کی پہلی محبت کا قصہ ہوا۔ میں نے پوچھا اس کا انجام؟ بولے۔ بھئی وہی نا جو ہوا کرتا ہے، اُس کی شادی ہو گئی اور ہم نوکر ہو گئے۔"

فیض کو پہلی نوکری ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں ملی، جہاں اُن کی ملاقات محمود الظفر اور اُن کی کمیونسٹ شریک حیات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :۔

...."پہلی محبت میں دونوں جہان ہارنے کے بعد فیض امرتسر ایم۔ اے۔ او کالج پہنچے۔ ان کی عجیب کیفیت تھی۔ محبت کے میدان میں پہلے تجربے کا اہم ترین پہلو تحیّر ہوتا ہے۔ اسی تحیّر کے عالم "گومگو" میں فیض امرتسر کے شہر میں گوا چ" گئے۔ غور فرمائیں فیض کبھی بیڈمنٹن کھیل رہے ہیں، تو کبھی کرکٹ ٹیم کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں کی نگاہ دُور رس نے اس تنہا لکچرار کو بھانپ لیا۔ پوچھا۔ "معاملہ کیا ہے؟ کسی کام میں تیرا جی نہیں لگتا۔" جب فیض نے جواب میں تکلف کیا تو بلا تکلف بولیں۔ "محبت میں ناکامی ؟" اور فیض نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے مشورہ دیا۔ یہ حادثہ تمہاری ذاتِ واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے، مگر یہ اتنا بڑا بھی نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔ انھوں نے فیض کو ایک کتاب مطالعے کے لیے دی اور پھر ملنے کے لیے کہا۔ بقولِ فیض انھوں نے اس کتاب کو پڑھا اور اُن پر چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ یہ کتاب (کارل مارکس کی) کمیونسٹ مینی فسٹو تھی۔

اور پھر فیض پکار اُٹھے :۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

نیا فیض جنم لے چکا تھا۔ اب فیض نئی منزلوں کا مسافر بن گیا، اور پھر :۔

"مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے"

فیض کے اس پہلے عشق کے بارے میں بس اتنا ہی معلوم ہے کہ اس کا انجام ناکامی پر ہوا۔ لیکن اس ناکامی کے غم کو وہ ساری زندگی سینے سے لگائے رہے۔ اس نے انھیں مایوسی کے اندھیروں میں پناہ لینے کے بجائے حوصلہ مندی اور امید کی ایک نئی روشنی عطا کی عشق میں مایوسی سے دل کو لہو کر دینے والا جو غم انھیں ملا، جس روحانی اذیت سے وہ دوچار ہوئے اس کی سرحدیں بنی نوع انسان کے بے کراں دکھوں اور محرومیوں سے مل گئیں۔ اپنی ابتدائی دور کی ایک نظم میں فیض اپنے رقیب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ۔۔

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

مفلوک الحال اور غریب محنت کش انسانوں کی زندگی سے یہ تعلقِ خاطر صرف اشتراکی مینی فسٹو کے مطالعے کا نتیجہ نہیں تھا' اس کی جڑیں کہیں اور تھیں۔ اگرچہ عشق کی ناکامی نے اسے اُبھارا اور اشتراکی ادب کے مطالعے نے اسے نظریاتی بنیاد فراہم کی۔ اس جذبہ کا سرچشمہ ان کی اپنی طبقاتی وابستگی تھی۔ فیض یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کر سکے کہ ان کے والد سلطان بخش (جو بعد میں سلطان محمد خاں کہلائے) پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں کالا قادر، کے سب سے مفلس اور نادار کسان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا حال خود فیض کی زبانی سنیے:۔

"جب یہ (ابا) پانچ برس کے ہوئے تو غربا کی روایت کے مطابق انھیں پڑھنے کے بجائے روٹی کمانے کا فن سکھایا گیا۔ دیہات والوں نے ہمارے ابا کو مویشی چرانے پر لگا دیا اور اس خدمت کے معاوضہ میں ان کی روٹی کا خرچہ برداشت کر لیا۔ اب ابا صبح سویرے ریوڑ لے کر دیہات سے باہر چلے جاتے۔ گلہ بانی کرتے' مویشی گھاس چرتے اور یہ کسی درخت کے سایے میں بیٹھے دُور اسکول اور طلبا کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے"۔

فیض بتاتے ہیں کہ ان کے والد کو بچپن سے ہی پڑھنے کا شوق تھا' لیکن ان کا گھرانہ اتنا غریب تھا کہ گاؤں کے اسکول میں بھی انھیں پڑھنے نہیں بھیج سکا۔ وہ ایک ماسٹر کی مہربانی سے اسکول میں جا کر پڑھتے تھے'، مویشی چراتے ہوئے سبق یاد کرتے تھے۔ اس طرح انھوں نے پرائمری اور مڈل کے امتحان پاس کر لیے۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے وہ لاہور میں موچی دروازے کی ایک مسجد میں جا کر رہنے لگے۔

فیض بتاتے ہیں:

"اب والد صاحب دن میں اسکول جاتے اور شام کو مسجد کا کام کرتے۔ کھانا محلے سے آجاتا اور پھر رات عشا کی نماز کے بعد لاہور ریلوے اسٹیشن چلے جاتے وہاں وہ رات گئے تک قلی گیری کرتے۔ اس طرح جو رقم جمع ہوتی وہ اپنے گھر والوں کو بھیج دیتے۔"

یہ بات فیض کبھی نہیں بھول سکے کہ اُن کے والد نے گاؤں کے ایک چرواہے اور پھر ایک قلی کی خدمت انجام دی (یہ بات الگ ہے کہ بعد میں وہ اپنی محنت اور کوشش سے

انگلستان میں افغانستان کے سفیر اور بیرسٹر رہے) اس لیے فیض ہمیشہ اپنے مقدر کو غریب محنت کش انسانوں کے مقدر سے ہی وابستہ کرتے رہے اور ایک بہتر زندگی کی جدّوجہد میں ان کا ساتھ دیتے رہے۔

یہ فیض کا دوسرا عشق تھا، جو پہلے عشق سے بڑھ کر ایک مستقل جنون بن کر ان کے سارے وجود پر چھایا رہا۔ اس کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانیاں دیں، قیدِ تنہائی کے دکھ جھیلے۔ برسوں اپنے بچّوں اور عزیزوں سے دُوری کا عذاب سہا، لیکن اس عشق سے دست بردار نہیں ہوئے۔

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

پاکستان بننے کے بعد جب وہاں مزدوروں کی ٹریڈ یونین تنظیمیں ازسرِ نو تشکیل دی گئیں تو فیض نے بڑی سرگرمی کے ساتھ ان کی رہنمائی کی۔ وہ شاعر اور صحافی تھے بظاہر مزدور تنظیموں سے ان کا کیا واسطہ ؟ لیکن نہیں، یہی بدحال طبقہ تو اُن کی تخلیقی فکر کا محرک اور موضوع تھا۔ اس لیے اُن کے حقوق، اُن کی آزادی اور ان کی بہتری کی ہر لڑائی میں انھیں شریک رہنا تھا۔ وہ محکمۂ ڈاک و تار اور ریلوے کرمچاریوں کی یونین کے سربراہ رہے۔ یہی نہیں۔ انھوں نے پاکستان کی ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے مزدور تنظیموں کی عالمی کانفرنسوں میں بھی حصہ لیا۔

"پاکستان ٹائمس" (انگریزی) کے اڈیٹر کی حیثیت سے بھی فیض پاکستانی حکومت کی عوام دشمن پالیسیوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے اور سامراجی طاقتوں سے اس کی سازباز کے نتائج سے متنبہ کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں کے محنت کش عوام میں محکومی سے نجات کی جو اُمنگ پیدا ہو رہی تھی، جو انقلابی قوتیں بیدار ہو رہی تھیں فیض اُن کی اہمیت بھی جتا رہے تھے۔ الغرض ان کی یہی خطائیں تھیں جن کی پاداش

میں پاکستانی حکومت نے انھیں مارچ ۱۹۵۱ء میں گرفتار کر کے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا اور اس طرح چار سال انھیں اس جرم (بغاوت) کی سزا دی گئی جو انھوں نے نہیں کیا تھا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

آخر راولپنڈی سازش کیس کی حقیقت کیا تھی؟ جس کے سرگروہ میجر اکبر خاں تھے اور جس میں فیض احمد فیضؔ اور سجاد ظہیر جیسے ادیبوں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ بے شک سجاد ظہیر پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے لیکن فیضؔ پارٹی کے عہدہ دار نہیں تھے۔ اس سازش کے بارے میں ایک موقع پر میں نے اور ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے سجاد ظہیر سے دریافت کیا تھا انھوں نے تقریباً وہی بات بتائی جو پاکستان کے بائیں بازو کے نوجوان دانشور طارق علی اپنی کتاب Can Pakistan Survive میں لکھتے ہیں:۔

"پاکستان کی نوعمر کمیونسٹ پارٹی اس منصوبے میں اس وقت ملوث ہوئی جب سجاد ظہیر ایک کاک ٹیل پارٹی میں میجر جنرل اکبر سے ملے —— جنرل نے ان سے مجوزہ بغاوت کے مسئلہ پر بات کی اور ان سے مینی فسٹو ڈرافٹ کرنے اور "ہٹ لسٹ" تیار کرنے کی درخواست کی۔ کمیونسٹ قیادت نے اس کی تائید کی اور فوجی افسروں کے ساتھ کئی نشستوں میں شرکت کی (سجاد ظہیر مرحوم نے ان ملاقاتوں کا ذکر نہیں کیا۔ ق ر) پھر یہ طے پایا کہ کچھ دنوں کے لیے اس منصوبے کو التوا میں رکھا جائے، لیکن فوجی سازش کاروں میں سے ایک نے اس خوف سے کہ شاید حقیقت کھل جائے، سرکاری گواہ بن کر سب اُگل دیا۔ سب سازشی پکڑ لیے گئے۔" ص ۵۶

فیضؔ اس سازش کی حد تک بے گناہ تھے، لیکن قید میں رہ کر وہ اپنے ملک کے عوام سے دُور ہونے کے بجائے کچھ اور قریب ہو گئے۔ اس دور میں وطن کی محبت اور شیفتگی کے جذبات ان کے اشعار میں کثرت سے آئے ہیں۔ ان کی محبت کے داغ اب اور زیادہ دُکھنے لگے تھے۔

یہ چند اشعار دیکھیے :۔

یہ دل کے داغ تو دُکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم
یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم

اسی قید میں انھوں نے اپنا وہ مشہور ترانہ لکھا تھا جس میں ایک نئے ولولے کے ساتھ خاک نشینوں کے انقلابی عزم کو دہرایا تھا۔

اے خاک نشینو! اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائینگے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زنداںوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھیں گے تنکوں سے نہ ٹالے جائینگے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے مارو لب کھولو چپ رہنے والو
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا، کچھ دُور تو نالے جائینگے

فیضؔ دیکھ رہے تھے کہ ظلم و استبداد کے خلاف یہ حشر خیز تحریکیں صرف ان کے وطن میں نہیں، ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں بھی سر اٹھا رہی ہیں۔ انھوں نے ساری دنیا کے حریت پسندوں اور باغیوں کی جدّ و جُہد سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا۔ اپنی نظم "آجاؤ افریقا" میں انھوں نے کینیا اور دوسرے افریقی ملکوں کے حریت پسند عوام کی آواز سے آواز ملائی ہے۔ ایران کے قید خانوں میں وطن پرست نوجوان شاہ کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ایرانی طلبا کے نام فیضؔ نے ان کی شہادت کا نوحہ اس طرح لکھا ہے :-

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ کون ہیں جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
یہ طفل جواب
اس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظالم اندھی آگ میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن

اسرائیلی جبر و استبداد کے مقابلے میں فلسطینی مجاہدینِ آزادی برسوں سے جو قربانیاں دے رہے ہیں فیضؔ نے اس کے درد بھرے نوحے اس طرح لکھے ہیں کہ وہ ان کا ذاتی غم محسوس ہوتا ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں سامراجی ملک بائیں نوجوانوں کی سرگرمیوں کو امنِ عالم کے مجاہدوں کو ہر طرح کے تشدد سے کچل رہے تھے۔ ایتھل اور جولیس روزنبرگ بھی امنِ عالم کے ان ہی شہیدوں میں تھے۔ فیضؔ کو ان کے آہنی عزم اور جذبۂ ایثار و سپردگی نے متاثر کیا اور وہ ان کی نظم میں جنگ اور ظلم کی اندھی طاقتوں کے خلاف انسانی مدافعت اور جہاد کی علامت بن گئے۔ منٹگمری جیل میں فیضؔ نے جب یہ نظم لکھی تھی تو خود ان کے سر پر موت کی تلوار جھول رہی تھی لیکن انھوں نے اپنے وجود کو دنیا کے مظلوم محنت کش انسانوں کی جدّ و جہد، ان کے مستقبل اور ان کی انقلابی آرزو مندیوں سے پوری طرح ہم آہنگ Identify کر لیا تھا۔ اس لیے ایتھل اور جولیس کی آواز میں انھیں اپنی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہاں ان کا عشق حسینۂ خیال اور وطن سے گزر کر آفاقی جہتوں میں داخل ہو چکا ہے۔

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی
جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض کی شاعری میں اُن کے یہ دونوں عشق اُن کی شخصیت کے ارتقا، ارتفاع اور عظمت کی علامت بن کر اُبھرتے ہیں۔ ان دونوں میں وہی اندرونی ربط و تسلسل ہے جو گنگوتری اور بحر بنگال میں ہے۔ گنگوتری عنفوانِ شباب کا بلاخیز اور ہیجان انگیز عشق تھا۔ وطن اور اہلِ وطن کی محبت گنگا کی طرح مقدس اور گہری تھی جس کے پُرسکون آغوش میں گنگوتری سو رہی تھی اور پھر یہ دونوں انسانیت کے سمندر میں، اس کے انقلابی آدرشوں کی وسعت میں اس طرح مل گئے کہ دوئی کا احساس مٹ گیا۔ فیض کی عشقیہ شاعری کی عظمت کا مطالعہ کرنے والے ہمیشہ اسی لازوال عشق کی روداد دہرائیں گے۔[۱۰]

❁❁❁
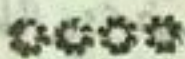
فیض اور کلاسیکی غزل

شمس الرحمٰن فاروقی

فیض کی غزل کا تذکرہ کرتے وقت عام طور پر جو بات سب سے پہلے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ فیض نے کلاسیکی علامات کو نئے معنی اور نئی معنویت عطا کی۔ یہ بھی کہا گیا کہ فیض کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کے طریق کار میں ہے، جس کی رو سے ان کے پاؤں کلاسیکی زمین میں مضبوط جمے رہے، لیکن انھوں نے اس بنیاد پر جو عمارت قائم کی اس کی دیواریں نئے ذہن سے نئے مسائل سے منقش تھیں۔ میں فی الحال اس بات سے بحث نہ کروں گا کہ دار، رسن، قاتل، واعظ، کوئے یار وغیرہ قسم کے الفاظ علامت ہیں بھی کہ نہیں۔ ہماری کلاسیکی غزل علامت کے تصور سے ناآشنا تھی۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس نہیں کہ جس چیز کا تصور بھی ہماری شعریات میں نہ رہا ہو، اس کا نہ صرف وجود ہو، بلکہ ہمارے شعرا اس سے واقف بھی ہوں۔ مغربی اصطلاحات و تصورات پر مبنی کچی پکی معلومات کی روشنی میں اردو ادب کی تفہیم و تحسین کی جو کوششیں ہمارے یہاں ہوئیں وہ اکثر نامشکور ہی رہی ہیں۔ اردو غزل میں علامت کا وجود ثابت کرنے کی سعی انھیں ناکام کوششوں کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ خیر، اس مسئلے پر مزید گفتگو نہ کرکے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فیض کی غزل بے شک ان رسومیاتی الفاظ اور تلازمات سے مزین ہے جو ہماری کلاسیکی شاعری کا نمایاں وصف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا فیض کی کلاسیکیت اور ان کا اجتہاد صرف اسی بات میں ہے کہ انھوں نے کوئے یار میں رقیب اور شیخ شہر سے نبرد آزمائی کو عار نہ جانا؟ اس سوال کی چھان بین صرف اس لیے ضروری نہیں ہے کہ فیض کی شاعری یوں بھی خاصے محدود دائرے اور محور کی شاعری ہے اور ان کے مداحوں کا یہ اشارہ کہ فیض کی کلاسیکیت محض ان چند

الفاظ و تلازمات کو نئے معنی دینے تک محدود ہے ۔ تعریف کے پردے میں ان کی مذمت ہی ہے ۔ اس سوال کی چھان بین اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ کلاسیکی غزل کے بعض بنیادی پہلوؤں پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے ۔ اور ایک بات یہ بھی ہے کہ فیض کی موت کے بعد پاکستان میں بعض لوگوں نے فیض کو سچا مسلمان ، عاشق رسول اور اہل دل صوفی بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا عجب نہیں کہ کچھ دنوں میں فیض کو کلاسیکی صوفی شاعر بھی تسلیم کر لیا جائے اور اس طرح ان کا اصلی ادبی کارنامہ صرف دار و رسن اور قیس و فرہاد کی صوفیانہ یاد تازہ رکھنے تک محدود قرار دیا جائے ۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شاعر قدیم الایام سے چلے آنے والے رسومیاتی الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن وہ خود جدید زمانے کا شاعر ہے تو ہم کس بنا پر یہ فیصلہ کریں گے کہ اس نے ان الفاظ کو نئے معنی دیے ہیں ؟ مثال کے طور پر یہ دو شعر ہیں ۔

نہ سوال وصل نہ عرض غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

پہلا شعر ظاہر ہے کہ فیض کا ہے اور دوسرا درد کا ۔ آپ کس بنا پر فیصلہ کریں گے کہ پہلے شعر میں سیاسی جبر کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے شعر میں معشوق کے جور کی طرف ؟ اگر آپ یہ کہیں کہ دونوں اشعار میں سیاسی جبر کی طرف اشارہ ہے تو فیض کی انفرادیت پر ضرب پڑتی ہے ، کیونکہ اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ غزل کے رسومیاتی مضامین و الفاظ کو سیاسی معنی میں برتنا فیض کا کوئی اختصاص نہیں ۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ فیض کے شعر میں سیاسی جبر کی طرف اشارہ اس لیے ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ترقی پسند تھے ، انقلابی تھے ، وغیرہ ۔ تو اس کے معنی تو پھر یہ ہوئے کہ ان رسومیاتی الفاظ کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ، ان کے معنی شاعر کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں ۔ اگر شاعر شیعہ ہے تو ان کے معنی شیعی ہیں ۔ اگر شاعر سنی ہے لیکن اہل حدیث ہے تو ان کے معنی سنی اہل حدیثی ہیں وغیرہ ۔ ظاہر ہے اس طرح فیض کی انفرادیت پھر خطرے میں پڑ جاتی ہے ۔ ممکن ہے اگر یہ کہا جائے کہ فیض چونکہ ترقی پسند تھے اس لیے جب وہ کسی کے عہد میں دل زار کے سبھی اختیارات کے چلے جانے کی بات کرتے ہیں تو اس میں وزن ہی اور ہوتا ہے ، اس میں حسن ہی اور ہوتا ہے ۔ لیکن اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر شعر کی خوبی خرابی کے بارے میں فیصلہ کرنے کے پہلے ہم شاعر کے سیاسی عقائد معلوم کریں ۔ ظاہر ہے کہ شعر کے وہ معنی جو شاعر کے عقائد کے بارے میں معلومات حاصل کیے بغیر آمد ہی نہ ہو سکیں ، علی الآخر باطل ہی

ہی ٹھہریں گے۔ کیونکہ اول تو تمام شاعروں کے سیاسی عقائد کے بارے میں معلومات نہیں، بلکہ اوقات تو شاعر کا نام بھی معلوم نہیں، اور دوسری بات یہ کہ اگر شعر کا حسن یا معنی ان اطلاعات پر منحصر و مبنی ٹھہرائے جائیں جو شعر کے باہر ہیں تو پھر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ خود شعر میں کوئی معنی نہیں ہوتے۔ ایسی صورت کو تسلیم کرنے کے بعد تنقید و تفہیم کے سب دروازے بند ہو جائیں گے اور خود فیض کی تمام شاعری معرض خطر میں آجائے گی، کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ فیض کے کلام میں فی نفسہٖ کوئی خوبی نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ چوں کہ وہ انقلابی اور ترقی پسند وغیرہ تھے اس لیے ان کے کلام کو سیاسی معنی پہنانے میں ایک طرح کا لطف ہے۔ ورنہ یہی شعر انھوں نے اگر درد کے زمانے میں، یا غالب کے زمانے میں کہے ہوتے تو انھیں کوئی گھاس نہ ڈالتا۔

ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ فیض کا بڑا کارنامہ دراصل یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی اصطلاحاتی الفاظ کو دوبارہ زندہ کیا اور انھیں غزل میں مقبول کیا۔ ورنہ فیض کے زمانے میں یہ سب خوب صورت الفاظ یا تو ترک ہو چکے تھے، یا اپنے معنی کھو چکے تھے۔ اس جواب میں دو مشکلیں ہیں۔ یہ بیان مخدوش ہے کہ دار و رسن قفس و نشیمن وغیرہ الفاظ کسی بھی وقت اپنے معنی کھو سکتے ہیں۔ یہ الفاظ دراصل ایک پورے رسومیاتی نظام کا حصہ ہیں اور ان پر غزل کی دنیا کے تمام مفروضوں کا دارومدار ہے جب تک وہ رسومیاتی نظام اور مفروضات باقی ہیں، یہ الفاظ اپنے معنی نہیں کھو سکتے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی رسومیاتی لفظ مثلاً "جور و ستم" میر کے شعر میں با معنی ہو اور آج کے زمانے کے شعر میں بے معنی ہو۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "جور و ستم" قسم کے رسومیاتی الفاظ اپنی دل کشی اور تازگی کھو چکے تھے۔ فیض نے انھیں دوبارہ دل کشی اور تازگی عطا کی۔ پھر سوال اٹھے گا کہ فیض نے یہ کارنامہ کیوں کر انجام دیا؟ آپ جواب دیں گے کہ فیض نے انھیں سیاسی معنی عطا کیے۔ لیکن وہی مشکل پھر آن کھڑی ہوگی کہ فیض کے شعر میں سیاسی معنی کی دریافت ان معلومات پر مبنی ہے کہ فیض سیاسی اور انقلابی شخص تھے۔ یعنی اگر ہم جج پر نرے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا والا شعر فیض کے کلیات میں پڑھتے تو اس میں سیاسی اور انقلابی معنی دریافت کرتے اور اگر اسے درد کے دیوان میں پڑھتے تو اسے محض شعبدہ شعر سمجھتے۔ لہٰذا کلاسیکی رنگ و آہنگ والے الفاظ میں جو دل کشی اور تازگی ہم فیض کے شعر میں دیکھتے ہیں وہ اس وجہ سے کہ ہم جانتے ہیں کہ فیض کے کچھ سیاسی عقائد تھے یعنی فیض نے ان میں کوئی شاعرانہ خوبی نہیں پیدا کی، یہ تو محض ان کی سیاست کا کرشمہ تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ مجھے قبول نہیں۔ اس وجہ سے قبول نہیں کہ میں اسے غلط سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کلاسیکی رنگ و آہنگ والے الفاظ ہمارے زمانے میں فیض کے علاوہ دوسرے بہت سے شاعروں نے استعمال کیے

ہیں، اور وہ فیض کے ہم خیال و ہم عقیدہ بھی تھے، لیکن ان کے یہاں ان الفاظ میں وہ حسن نظر نہیں آتا جو فیض کے یہاں ہے۔ لہٰذا فیض کی عظمت اس بنیاد پر نہیں قائم ہو سکتی کہ انھوں نے غزل کے کلاسیکی عشقیہ رسوماتی الفاظ کو سیاسی معنی دیئے۔ یہ صفت تو مخدوم، مجروح، ساحر، غلام ربانی تاباں تینوں کے یہاں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی فیض کا مد مقابل نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نئے معنی کی دریافت کے اس عمل میں فیض کو اولیت حاصل ہے، تو یہ بھی درست نہیں۔ ترقی پسندوں میں سب سے پہلے مخدوم نے نے غزل کو باقاعدہ طور پر اختیار کیا اور سیاسی موضوعات کو غزل میں برتنے کی رسم حسرت موہانی، محمد علی جوہر اور اقبال نے قائم کی۔ "دست تہ سنگ" کے دیباچے میں فیض نے حسرت موہانی کا ذکر کیا ہے۔ اس دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۸ء کے آس پاس ہوا۔ اس وقت محمد علی جوہر زندہ تھے اور ان کی سیاسی غزل ایوان ادب میں گونج رہی تھی۔ حسرت کا دبدبہ بطور غزل گو پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور اقبال تمام نئے شعرا (شمول جوش) کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ خود فیض نے اقبال کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ترقی پسند شعرا کی ممتاز نظموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا فیض کے سامنے غزل کی ایسی مثالیں وافر تھیں جن میں سیاسی موضوعات کو برتا گیا تھا۔

اس تجزیے کی روشنی میں کہنا پڑتا ہے کہ فیض کی غزل میں کلاسیکی رنگ کی حسن و خوبی کا سراغ اس بات سے نہیں لگ سکتا کہ انھوں نے بعض رسومیاتی الفاظ کو بڑی کثرت سے برتا اور ان میں سیاسی معنی داخل کیے۔ تنقید کی دنیا میں یہ مشکل اکثر پیش آتی ہے کہ ہم خوبی کا پتہ تو لگا لیتے ہیں، لیکن اس کی وجہ دریافت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مرے کریگر نے Murray Krieger اپنی کتاب Theory of Criticism میں اس نکتے کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اگر ہمیں کوئی ایسا تجربہ حاصل ہو جسے ہم "جمالیاتی" کے لفظ کے ذریعہ بیان کریں تو یہ قرین قیاس ہے کہ ہم اس تجربے کی علت اس شے میں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہمیں یہ تجربہ حاصل ہوا ہے، اور پھر اس طرح ہم اس شے کو جمالیاتی قدر کا حامل بتائیں گے لیکن بطور نقاد کے ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جمالیاتی علت ہم میں ہے یا واقعی اس شے میں ہے۔ قطعی لغوی طور پر تو یقیناً یہی کہا جائے گا کہ اس جمالیاتی تاثر کا سرچشمہ ہمارے ہی اندر ہو گا کیونکہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس شے کا سامنا کرنے پر وہ تاثر حاصل نہیں کرتے ...... کیا کسی شے میں کوئی ایسی جمالیاتی خاصیت ہوتی ہے، جسے ہم محسوس کرتے ہیں (یا ہم کو جسے محسوس کرنا چاہیے) اگر ہم نے وہ جمالیاتی

خاصیت دریافت کرلی ہے اس طرح کہ ہمارا تجربہ (جس حد تک وہ جمالیاتی ہے)
اس خاصیت کے تعلق سے مناسب اور صحیح تاثر ہے، تو پھر ہمیں اس خاصیت
کی وضاحت کرنے اور اس کو بیان کرنے پر اپنے جمالیاتی تجربے سے مشابہ تجربے کو
دوسرے قارئین تک پہنچانے پر قادر ہونا چاہیے۔

آگے چل کر کریگر کہتا ہے کہ نقاد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تجربے کے اندر شے Object in
Experience اور شے کا تجربہ Experience of Object میں فرق کر سکے۔ یعنی وہ یہ
بتا سکے کہ شعر میں جو خوبی وہ دیکھ رہا ہے، وہ اس کے دماغ کی اختراع نہیں ہے اور اس خوبی کے بیان کے
ذریعہ یہ حکم لگایا جا سکے کہ جن شعروں میں یہ خوبی ہوگی ان سے فلاں قسم کا تجربہ حاصل ہو سکے گا۔ اگر کسی
نظم کے تجربے کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کے مختلف اجزا اپنی اپنی شخصیت کو برقرار رکھیں، تو پھر
ان اجزا کی یہ خصوصیت مشکوک ہو جاتی ہے کہ ان کے ذریعہ ایک متحد اور خود مکتفی Unifed اور
Self Enclosing تجربہ حاصل ہو سکتا ہے۔ فیض کی کلاسیکیت کی تحسین کرنے والوں کی یہی شکل
ہے، وہ کہتے ہیں کہ فیض کی غزل میں الفاظ الگ ہیں اور ان کے سیاسی معنی جو فیض کے عقائد نے ان میں
داخل کئے ہیں، وہ الگ ہیں، کیوں کہ انھیں الفاظ میں انھیں وہی سیاسی معنی تو مجروح اور دوسروں کے
یہاں بھی ہیں لیکن فیض کے علاوہ کسی میں وہ بات نہیں۔ لہٰذا وہ اس بات کو واضح کرنے میں ناکام رہتے
ہیں کہ وہی نسخہ جو فیض کے یہاں کارگر ہے، دوسروں کے یہاں بے فیض کیوں رہ
جاتا ہے؟

اس سوال کو حل کرنے کے لئے مزید دو شعروں کی روشنی میں بعض نکات کی طرف آپ کی
توجہ مبذول کرتا ہوں۔ پہلا شعر حافظ کا ہے اور دوسرا ظاہر ہے کہ فیض کا ہے

عقاب جور کشاد است بال بر ہمہ شہر
کمان گوشہ نشینے و تیر آہے نیست

بیداد گروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

اس بات سے قطع نظر کہ حافظ کا شعر بہت اعلیٰ درجہ کا ہے اور فیض کا شعر ان کے اچھے
اشعار میں نہیں، پوچھنے کا سوال یہ ہے کہ ہم یہ فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں کہ حافظ کا سیاسی نہیں ہے
اور فیض کا شعر سیاسی ہے؟ پھر، کیا ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فیض کا شعر اگرچہ حافظ کے شعر سے

بہت پست ہے، لیکن اس لیے قابل تعریف ہے کہ اس میں سیاسی پہلو بھی ہے، یعنی اور کسی پہلو کے علاوہ سیاسی پہلو بھی ہے کیا سیاسی شاعری کے لیے ایسے اصول مقرر ہو سکتے ہیں جن کی روشنی میں ہم سیاسی کو غیر سیاسی شاعری سے الگ کر سکیں؟ یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دکھا سکیں کہ غیر سیاسی شاعری پر مبنی رسومیات کی پابندی کرتے ہوئے بھی سیاسی شاعری ہو سکتی ہے، کیوں کہ وہ رسومیات ہے؟ یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ کسی رسومیاتی نظام کو ہم پوری طرح برتیں، لیکن اس کے جو معنی نکلیں وہ غیر رسومیاتی ہوں؟

ان تمام سوالوں کے جواب مہیا کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میں اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حافظ کا شعر سیاسی معنی کا متحمل ہو سکتا ہے، لیکن ہم اس کو سیاسی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس میں سے سیاسی معنی جو ہم برآمد کریں گے ان کا تعلق شعر کی Signification سے ہوگا اس کے اصل معنی سے نہیں۔ اور یہ استعارے کی خوبی ہے کہ وہ Signification کے لیے دروازے کھول دیتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں جس کی رو سے ہم اس شعر کو غیر سیاسی قرار دیں لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا پیمانہ بھی ہے جس کے اعتبار سے ہم اس کو محض سیاسی قرار دیں۔ شعر کی معنویت اس کے معنی کا حصہ ہوتی ہے لیکن اس کے معنی کا دائرہ اس کی معنویت سے چھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔ فیض کا شعر حافظ کے شعر کے مقابلے میں کم کارگر ہے، اگرچہ اس میں بھی سیاسی معنویت ہے۔ کم کارگر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی معنویت جس معنی پر قائم ہے۔ وہ حافظ کے شعر کے معنی سے کم ہے۔ معنی کے ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ حافظ کے شعر میں چار استعارے اور چار پیکر ہیں۔ یعنی جو استعارے ہیں وہی پیکر بھی ہیں۔ عقاب، جور، بال کشا دست بر ہمہ شہر، کمان گوشہ نشینے و تیر آہ ہے۔ پھر دو چیزوں کا ہونا جو پہلے مصرعے میں بیان ہوئی ہیں فیض کا شعر ان خوبیوں سے خالی ہے۔ فیض نے جہاں کلاسیکی اسلوب کو کامیابی سے برتا ہے وہاں کیفیت یا مضمون آفرینی کی کارفرمائی ہے۔ ورنہ سیاسی پہلو یا فلسفیانہ پہلو یا عشقیہ پہلو کسی میں کوئی ایسی خوبی فی نفسہ نہیں جو شاعرانہ خوبی سے ضامن ہو سکے۔ بات فیض کی غزل کی ہو رہی تھی، لیکن انھوں نے اکثر نظموں میں بھی غزل کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس میں "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کے پہلے دو مصرعے پیش کرتا ہوں۔ پھر فارسی کا ایک شعر جو غالباً نظیری کا ہے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

فارسی شاعر کہتا ہے ؎

در روزگار عشق تو ما ہم فدا شدیم　　　افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نہ ماند

مضمون آفرینی او رکنایاتی انداز بیان کی تمکنت نے فارسی کے شعر کو یادگار بنادیا ہے۔ فیض کے یہاں رعایت تضاد موجود ہے، لیکن مضمون کی پیش پا افتادگی نے فیض کے یہاں تمکنت کے بجائے Selfpity پیدا کردی ہے جہاں مضمون آفرینی ہوتی ہے وہاں Selfpity نہیں ہوتی۔ جہاں کیفیت ہوتی ہے وہاں Selfpity کا خطرہ ہوتا ہے۔ فیض ہمارے ان جدید شعرا میں ہیں جنہیں ان کلاسیکی اصطلاحوں اور تصورات کی اہمیت کا احساس تھا۔ ان میں سے بعض پر انھوں نے ایک مضمون بھی لکھا ہے۔ ہم لوگوں نے مغربی تعلیم کے زیر اثر ان اصطلاحوں سے بے گانگی اختیار کرلی تھی۔ جب ہمارے ذوق سلیم نے فیض کی غزل میں کلاسیکی رنگ محسوس کیا تو اس کی وجہ دریافت کرنے کی مہم میں ان اصطلاحوں اور تصورات سے مدد نہ لے سکے۔ لہٰذا ہم صرف یہ کہہ کر رہ گئے کہ فیض نے شیخ، برہمن، واعظ، کوئے یار، رقیب، منزل، دار، رسن، وغیرہ کلاسیکی رسومیاتی الفاظ کو نئے معنی میں استعمال کیا ہے۔ فیض کے بہت سے عمدہ اشعار میں رسومیاتی الفاظ نہیں ہیں، پھر ان کی کامیابی کا راز کیا ہوسکتا ہے؟ اس فہرست میں فیض کے بعض مشہور ترین اشعار بھی ہیں ؂

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کتنی

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہونچے

فیض نے غزل میں کلاسیکی رنگ کو جس طرح زندہ کیا وہ ہماری شاعری کا ایک روشن باب ہے۔ ان کی غزل میں اردو غزل کی وہ تہذیب بول رہی ہے جس میں مضمون آفرینی اور کیفیت کا عمل دخل تھا۔ فیض کے یہاں کیفیت کا جادو لفظوں میں چڑھ کر بولتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ غزل کی تہذیب کے پس منظر میں فیض کا مطالعہ از سر نو کیا جائے۔

فیض احمد فیضؔ کی علامتیں

تبسم کاشمیری

البرکاموکو جب ادب کا نوبل پرائز ملا تو انھوں نے اس موقعہ پر فن کار اور سوسائٹی کے باہمی رشتوں پر تقریر کرتے ہوئے کہا "میری رائے میں فن ایک انفرادی لذت اندوزی کا نام نہیں ہے یہ درحقیقت ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے عامۃ الناس کے سامنے ان کی مشترک مصیبتوں اور راحتوں کی ایک موثر تصویر کھینچ کر ان کے اندر زیادہ سے زیادہ حرکت پیدا کی جا سکتی ہے فنکار کے سامنے دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں ایک ذوقِ جمال جسے وہ کسی حال میں نہیں چھوڑ سکتا اور وہ اپنی پوزیشن ان دونوں کے بالکل وسط میں متعین کرتا ہے کاموکا یہ بیان فیض احمد فیض کی شاعری کا صحیح رخ دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔

فیض کی شاعری رومان اور حقیقت کے ٹکراؤ سے مرتب ہوتی ہے اس شاعری میں رومان کی نوعیت اختر شیرانی کے رومانوی افکار سی نہیں جو سماجی حالات سے بغاوت کر کے ماورائی وادیوں میں گم ہونا پسند کرتے ہیں فیض ادب کو گوشۂ فراغت نہیں سمجھتے، بلکہ فیض کے رومانوی رجحانات کی جڑیں اپنے سماج سے پیوست ہیں سماجی رجحانات کی تشکیل میں مادی حقائق کی تلخیوں اور رومان کے ٹکراؤ سے ان کی ذات میں درد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے فیض کے ہاں مادی حقائق اور رومانی رجحانات سے مرتب ہونے والے اس درد کا احساس نقش فریادی کے دوسرے دور سے شروع ہوتا ہے اور آج تک ان کے شعری تجربہ میں اس احساس کی لہریں ملتی ہیں ان کا یہ احساس صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے رشتے دور تک پھیلتے چلے گئے ہیں ذات کا یہ عکس کائناتی حقائق میں منعکس ہوتا نظر آتا ہے احساس کے اس مرحلے کی دریافت سے فیض خالصتاً رومانی دائروں سے نکل کر اجتماعی طرزِ احساس کے دائروں میں داخل

ہو جاتے ہیں، خود مرکزیت کے منطقے ٹوٹ کر باہمی عمل میں شامل ہو جاتے ہیں، اس تہذیبی عمل میں ان کا شعور مکمل طور پر معاشرہ سے ہم آہنگ ہے خارج کی محرومیاں اور ناکامیاں، سماجی ظلم، طبقاتی تقسیم سرمایہ دارانہ نظام یہ سب صداقتیں ان کے لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں ۔

فیض کی شاعری کا دور بڑا ہنگامہ پرور تھا اس دور میں ترقی پسند تحریک کے ذریعے مارکسی رجحانات تیزی سے پھیل رہے تھے۔ طبقاتی تقسیم کا احساس شدت سے محسوس ہو رہا تھا آزادی ہند کا نعرہ پورے ملک میں گونج رہا تھا کمیونسٹ پارٹی کا لائحہ عمل یہ تھا کہ غیر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کی جائے اور پھر ملک میں ایک غیر طبقاتی اور لادین نظام کو نافذ کیا جائے، جہاں انسانوں کو پوری مساوات حاصل ہو گی فیض کی شعری علامتوں میں ان تصورات کی پرچھائیاں بار بار نظر آتی ہیں ۔

علامت کے متعلق اپنے نقطہ نظر کا اظہار فیض نے ایک مضمون "جدید اردو شاعری میں اشاریت" میں کیا ہے ۔

"علامت سے ہم ایسے استعارے مراد لیتے ہیں جنہیں شاعر اپنے بنیادی تصورات کے لئے استعمال کرتا ہے جس طرح ہم کسی ایک لفظ کو اصطلاح قرار دے کر اس کے خاص معنی مقرر کر لیتے ہیں خواہ اس کا مفہوم کچھ ہی کیوں نہ ہو اسی طرح شاعر اپنے تجربات کے اظہار میں بعض الفاظ کو اصطلاحات قرار دے لیتا ہے شاعر اور اس کے سننے والے میں ایک مفاہمت سی ہو جاتی ہے"

فیض صاحب علامت کو اصطلاح سمجھتے ہیں اور اس سے خاص معنی مقرر کر کے مفاہمت تلاش کرتے ہیں اس سے علامتی مفہوم کی حدیں محدود ہو جاتی ہیں وہ علامت کو اصطلاح قرار دے کر اس کی معنویت اشارہ کے قریب کر دیتے ہیں اصطلاح میں معنی کا یقینی تصور پایا جاتا ہے جب کہ علامت میں معنویت کا غیر یقینی تصور پیدا ہوتا ہے اور علامت میں جب کوئی یقینی حوالہ پیدا ہو گا، علامتی معنویت کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

فیض کا تخلیقی عمل اپنے ہم عصر ترقی پسند شاعروں سے مختلف ہے ترقی پسند شاعری میں تجربہ، جذبہ اور اس کا اظہار سامنے کی چیزیں بن کر رہ جاتا ہے مگر فیض کے ہاں تخلیق سامنے کی بات نہیں بنتی بلکہ ان کی تخلیق جذبہ اور تجربے کی آمیزش سے تشکیل پاتی ہے اور یہ تشکیل اظہار کے لئے علامتی سانچے تلاش کرتی ہے تخلیقی عمل کی یہی وہ علامتی صورت ہے جو انہیں اپنے عہد میں منفرد کر دیتی ہے ان کے ہاں تخلیقی عمل میں تجربہ کا رخ بالعموم موضوعی ہے، اس لیے ان کی تخلیق عام ترقی پسندوں کی طرح سامنے کی بات نہیں رہتی، تلازمات و تجربات اور موضوعیت کی گھمبیر تا نظر آتی ہے جو علامتی سانچوں میں ڈھلتی جاتی ہے ۔

فیض کے ہاں علامتیں اپنے مخصوص ذہنی* پس منظر کے ساتھ آتی ہیں سحر، رات، ظلمت، سویرا سویرا، شفق اور پرچم وغیرہ کی علامتیں ان کے بنیادی رجحانات کو ظاہر کرتی ہیں فیض نے غزل کی ان علامتوں میں جو مردہ ہو چکی تھیں نئے معنوی سلسلے دریافت کیے ان کے ہاں یہ علامتیں سیاسی و سماجی حقائق کے مفہوم میں آئیں۔ " رات " پرانے نظام اقدار و روایات کی علامت بنتی ہے جب کہ "سحر" مستقبل کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

تکنیکی حوالے کا آغاز "نقش فریادی" کی نظم "اے دلِ بیتاب ٹھہر" سے ہوتا ہے اس میں "رات" پرانی نظام اقدار کی علامت ہے اور "سحر" مستقبل اور نئی اقدار کے عہد کی علامت بن جاتی ہے۔

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

"سیاسی لیڈر کے نام"

اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اِک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

"سرِ مقتل"

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

اگست ۱۹۵۲ء

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں

یہ وہ چند مثالیں ہیں جو اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ "رات" اور صبح یا سحر کی علامتوں سے جو تصورات "لے دل بیتاب ٹھہر" میں قائم کئے گئے تھے وہی تصورات ان علامتوں سے وابستہ ہوکر اسی صورت میں معنوی حوالہ کے طور پر بار بار استعمال ہوتے ہیں ان کی معنویت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی رات اور سحر کے یہی علامتی رابطے بعد میں پوری ترقی پسند شاعری کی روایت بن جاتے ہیں اور یہ روایت ایک ——— Cliches کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

رات کے علامتی تصور کو پیش کرنے کے لئے "ملاقات" اچھی نظم ہے اس نظم میں رات مرکزی علامت بنتی ہے اور" مہتاب" "ستارے" "نور" "سیاہی" "نہر خون" وغیرہ ایسے علامتی تلازمات ہیں جو رات کے معنوی تصور کو پھیلاتے ہیں ترقی پسند شاعری میں رات کی جو علامات بنتی ہیں وہ اظہار کی صورت میں کھلے وضاحتی اشارے مہیا کرتی ہیں جس کے باعث اس میں سادہ معنوی حدیں متعین ہونے لگتی ہیں جس سے علامت کے رشتے اکہری صورت سے متعلق ہوجاتے ہیں اور اشارہ بن جاتے ہیں مگر فیض کی علامتیں انہیں ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ماحول کی محض تعمیم نہیں ہے۔ وہ چیزوں کو جوں کا توں نہیں دیکھتے ان کے ہاں ماحول سے جذباتی ردعمل کی داخلی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ کیفیت بالعموم علامتی صورتوں میں اپنا اظہار کرتی ہے، وہ معروضات کو داخلی جذبہ اور تجربہ کے سفر سے گزر کر سامنے پیش کرتے ہیں اور اس سفر میں جذبہ اور تجربہ تعمیم کے حدود سے گزر کر سامنے کی چیز نہیں رہتا، داخلی احساسات اور واردات کو سمیٹتے ہوئے وقتی فاصلوں کو طے کرکے آفاقی منطقوں میں آجاتا ہے "ملاقات" میں بھی خارج کی شکست وریخت جو محض ذات کی شکستگی نہیں۔ اجتماعی تہذیبی عمل کی شکستگی ہے رات اور اس کی تلازماتی علامتوں میں موجود ہے۔

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہر خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موج زر جو تیری نظر ہے
الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں

سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھِل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں کے آتشِ ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

"یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم" اس نظم میں بھی ذات کی شکستگی کی بعض علامات میں اس میں شکست اور ناکامیوں کے باوجود خود پر ترس کھانے کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ناکامی کے نشان مٹا کر نئی جستجو کے لئے عمل کا جذبہ ہے۔ اس کیفیت سے علامتوں کی یہ صورت بنتی ہے۔

سب کاٹ دو بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو بے کل پھولوں کو
شاخوں پر بلکتے مت چھوڑو
کھیتی کے کونے کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی آگ بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی بات کرو

فیض کے ہاں بعض ایسی علامتیں ہیں جو انفرادی ہیں۔ ان علامتوں کی بنیادیں زیادہ تر طبقاتی اور تقسیم اور سماجی کشمکش سے استوار ہوتی ہیں۔ ان رجحانات سے جن علامات کی تخلیق ہوئی ہے، ان میں کتے کا ذکر ضروری ہے کتے اس سماجی طبقے کی علامت ہے۔ جس کی آزادی کی حس مر چکی ہے اور وہ مسلسل ظلم و ستم برداشت کرتا ہے فیض اس طبقے میں باغیانہ جوہر کی تلاش کرتے ہیں۔ یہ نظم تمام تر علامتوں سے مرتب ہوئی ہے اور شاید مکمل علامتی نظم ہے۔ اس میں کہیں بھی وضاحتی حوالہ نہیں۔ لفظوں کی معنوی حدیں پھیلی ہوئی

ہیں۔ ایک اور نظم "بول" اسی قسم کے علامتی عمل سے بنتی ہے ان علامتوں میں بغاوت کے رجحان ہیں، باغیانہ رجحان اور راستے کی رکاوٹوں سے اس نظم کی علامتیں تیار ہوتی ہیں۔

دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر ایک زنجیر کا دامن

بول: یہ تھوڑا وقت بہت ہے جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

"آہن گر کی دکان" "سرخ آہن" اور "تند شعلے" "قفلوں کے دہانے" "زنجیر کا دامن وہ تمام خارجی مزاحمتیں ہیں جنہیں علامتوں میں ظاہر کیا گیا ہے یہ نظم آزادی سے قبل لکھی گئی تھی جب کہ تحریکِ آزادی زوروں پر تھی اس "پس منظر" میں "آہن گر کی دکان" برطانوی سامراج کی علامت ہے اور دوسری علامتیں مظالم کی صورتیں ہیں یہ معنویت صرف ایک پس منظر رکھ کر نکالی گئی ہے ویسے یہ علامتیں کسی خاص امر واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کرتی ہیں اس لیے ان کے معنی محدود نہیں ہیں ان علامتوں کا عام رجحان قید و بند اور غلامی و آزادی کے آفاقی تصورات سے بنتا ہے۔

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

فیض کا نظریۂ سخن

محمد صفدر میر

ہمارے عہد کا ادبی شعور اپنی ایک مخصوص ہیجانی کیفیت رکھتا ہے جو ہمارے روایتی ادب کی ذہنی فضا سے بہت مختلف ہے اور کئی پہلوؤں سے متضاد قدیم اور جدید ادب کی بحث ایک عرصے سے جاری ہے اس کا تعلق اصنافِ سخن اور ہئیتی سانچوں سے اتنا نہیں جتنا دو ادوار کی ذہنی فضاؤں کے اختلاف سے ہے۔

انیسویں صدی سے پہلے کا معاشرہ ہماری تمام زبانوں اور کلاسیکی اور روایتی ادب کا پس منظر ہے۔ اس معاشرے کے عناصر میں سب سے زیادہ اہمیت اس خود کفیل، محدود اور غیر متغیر معاشی سیاسی نظام کو ہے جسے فیڈرل یا جاگیرداری نظام کا نام دیا جاتا ہے۔ اس معاشی سیاسی نظام کی بنیادوں پر استوار معاشرتی ماحول اپنے مخصوص ادارے رکھتا ہے اور ان سے ہم آہنگ فکری، اخلاقی، مذہبی عقائد، اقدار اور مسلمات کا مربوط شیرازہ منسلک ہے۔ یہی عقائد، اقدار، مسلمات اس دور کی ذہنی فضا کو متعین کرتے ہیں اور معاشرے کے ہر فرد اور ہر گروہ کے طرزِ عمل کی کسوٹی کا کام دیتے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک مکمل اور محکم فکری کائنات ہے۔ اس کائنات کے اندر رہنے والوں کے لیے اس کے باہر نہ کوئی کائنات ہے نہ ہو سکتی ہے۔

سترھویں اٹھارھویں صدی کے مغل ہندوستان کی خانہ جنگیوں، بیرونی حملوں، متواتر قتل و غارت، معاشی اور سیاسی بحرانوں کی وجہ سے معاشرہ ایک ہمہ گیر شکست و ریخت سے دوچار ہوا، لیکن اس کی مخصوص ذہنی فضا اپنی جگہ قائم رہی۔

اس عالمگیر تباہی کے زمانے میں اردو کا بیشتر کلاسیکی ادب پیدا ہوا اور اپنے نقطۂ عروج تک پہنچا اور اسی بات سے ہمیں حیرانی ہوتی ہے۔

اپنی مخصوص بے صبری سے کام لیتے ہوئے کبھی ہم اپنے نئے سیکھے ہوئے معیاروں کے مطابق اپنے کلاسیکی ادب کو جانچتے ہیں اور فتوے لگاتے ہیں کہ اُس زمانے کے شاعر اپنے ماحول سے بے خبر تھے اور اپنی ہی تخیلی دنیا میں رہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے باغ کی طرف کھُلنے والی کھڑکی بھی بند رکھا کرتے تھے۔ پھر کبھی ہم اُن کے کلام کی توجیہیں کرنے لگتے ہیں کہ اُن کے زمانے کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے اشرات غزل کے سیدھے سادے اشعار میں سے برآمد کر ڈالتے ہیں۔ جیسے وہ شاعر نہ ہوں وقائع نویس ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے شاعروں کی تخلیقات میں اُن کے بکھرے ہوئے معاشرتی نظام کے زوال کا احساس بہت کم ملتا ہے، بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے اُن کو اپنے ماحول میں ہونے والی کسی بڑی تبدیلی کا احساس تک نہ ہو جیسے اُن کے لیے اپنے شیرازہ بند نظامِ حیات و کائنات کے قائم و دائم رہنے کے بارے میں شک و شبہ کا کوئی شائبہ تک ہو۔ ان کی ذہنی فضا میں ویسا ہی ٹھہراؤ، توازن، سکون اور یک جہتی نظر آتی ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے عروج کے زمانے کے ان کے پیش رو فارسی شعرا کے ہاں ملتی ہے۔ اگر کہیں آشوبِ زمانہ اور گردشِ لیل و نہار کی شکایت بھی ہے تو اپنے روایتی، فکری اور معاشرتی ماحول کے مناظر میں اور اُس کے محدود دائرے کے اندر ہی۔ اسی قائم و دائم معاشرتی سانچے کے مطابق، جس کے علاوہ اور کوئی معاشرتی سانچہ اُن کی نظر میں ممکن ہی نہ تھا۔

اس محدود معاشرتی ماحول اور اُس کے محدود ممکنات کے دائرے میں انسان کی زندگی ازل سے ایک لامتناہی گردش میں سفر کرتی رہی ہے اور اب تک اسی طرح اَبد تک گردش کرتی رہے گی۔ اُس کے نشیب و فراز، اُس کے بہار و خزاں، اُس کے اندرونی تضادات کے بارے میں مختلف شاعروں کا رویہ متنوع ہو سکتا ہے۔ کوئی اُسے نور و ظلمت کی کشمکش سے عبارت کرے، یا کفر و اسلام کے تضاد سے، یا ان دونوں سے ماورا، اپنے جہان کی محکم بنیاد "خالی از خلل" محبت پر رکھے۔ جہان معنی سب کا ایک ہی ہے۔ امیر خسرو، عرفی، نظیری، محمد قلی قطب شاہ، ولی، میر، سودا، وارث شاہ، شاہ لطیف، رحمان بابا، سب ایک ہی دنیا کے باشندے ہیں۔ اُس کے باہر، اُس کے علاوہ یا اُس کے برعکس کوئی اور دنیا ممکن ہی نہیں۔ اس مکمل اور محدود بے تغیر تصورِ کائنات

پر ایمان ہمارے کلاسیکی ادب کی ذہنی فضا کا خاصا ہے جو ہمارے اپنے زمانے کے ادبی شعور کی مضطرب ہیجانی، ہردم متغیر اور لامحدود امکانات کی حامل کیفیت سے نوعی طور پر مختلف ہے۔

غالب کی شاعری میں شاید ہمیں پہلی بار اپنے کسی کلاسیکل شاعر کے یہاں اپنے معاشرے کے روایتی تصور حیات و کائنات اور اس کی بنیادی مسلّمات کے بارے میں تشکیک کا اتنا گہرا اثر ملتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس کی ذہنی فضا اپنے پیش رووں سے کچھ مختلف ہو، اس کے معتقدات اس کا نقطۂ نظر اس کے جہانِ معنی کے مُسلّمات بالکل وہی ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے یہاں اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ اُن کا اس زندگی کے حقیقی ماحول سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ غالب فیوڈل ہندوستان کی پُرانی اور نوآبادیاتی سرمایہ داری نظام کی نئی دنیا کے سنگم پر کھڑا ہے اور اپنے شعری شعور میں اس فکری اور اخلاقی بحران کا اظہار کرتا ہے جو مختلف معاشرتی دنیاؤں کے تخالف اور ٹکراؤ سے پیدا ہوا۔ اس میں ایک نئی دنیا کی تخلیق اور اس کے لیے موزوں تصوراتی پیکروں کی تشکیل کے بارے میں بھی کچھ اشارے ملتے ہیں اور ممکنات کی ایک نئی کائنات کا خیال بھی لیکن اس کی روایتی ذہنی فضا کے دائرے میں اس خیال کی کسی واضح صورت کی نقش گری ممکن نہ تھی۔ اس کام کے لیے کسی ایسے شاعر کی ضرورت تھی جو دونوں ٹکراتی ہوئی دنیاؤں کی مادی، معاشرتی اور فکری بنیادوں سے واقف ہوتا اور ان کے سارے تضادات کو اپنے نفس میں جذب کر کے اپنے تخیّل کو متصادم قوتوں کے پُرہول جدل کا میدان بنا کر اُن کے اجزاء سے ایک نئی ترکیبِ معنوی اور ایک نئے جہانِ تمنّا کی تخلیق کر سکتا۔

یہ کام اقبال کے لیے ممکن ہوا، اور فکر و کلام کی اسی بلند سطح پر جہاں سے غالب نے اس کے امکان کی جھلک سی دیکھی تھی، اقبال کا طرزِ احساس غالب سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غالب ہی کی رُوح نے اقبال کے پیکر میں دوبارہ جنم لیا ہو، تاکہ اس کے لیے اپنی تشنۂ تکمیل خواہش کو پورا کر سکے۔

یہ محض شعری روایات کی ہم آہنگی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ہم مشرب شاعرانہ شخصیتوں اور ان کے عزائم کی مماثلت کا بھی ہے، اور اس کے ساتھ ہی کسی قوم کی رُوح کے زمانی تسلسل کا۔ کیونکہ جس

طرح اقبال میں غالب کی معنوی صورت کی جھلک نظر آتی ہے اسی طرح غالب میں عرفی اور نظیری کے پیکروں کی جھلک ملتی ہے۔ معاشرتی ماحول کے فرق اور زمانے کے بعد کے باوصف ان مختلف زمانوں کے شاعروں کے درمیان اس طرزِ احساس کی یہ عبرت ناک مماثلت اور فکری اسلوب کا یہ تسلسل اتفاقی امر نہیں ہے۔ شاید یہ بھی اس پُر اسرار حقیقت کا ایک مظہر ہے جسے قومی شخصیت کہتے ہیں جو کسی قوم کی زندگی کے مختلف ادوار پر حاوی ہوتی ہے؛ اور جو صدیوں تک عہد بہ عہد بدلنے میں روحِ عصر کے ساتھ متصل اور متحد ہو کر از سرِ نو جوان اور تازہ دم ہوتی رہتی ہے۔

قومی شخصیت اور رُوحِ عصر کا یہی نقطۂ اتصال کسی عہد کے منفرد اور نمائندہ شاعروں کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے؛ اور شدید خود مرکزیت کے باوجود ایک دوسرے کا آئینہ بناتا ہے اور سب کو ایک ہی رشتے میں پروتا چلا جاتا ہے۔

اقبال کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے ہمارے زمانے کے مواد اور اس کی ساخت ہماری قوم ظاہر و باطن، اس کے عزائم و مقاصد میں بنیادی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اگر غالب فیوڈل عہد کے انجام اور نوآبادیات سرمایہ داری کے آغاز کے سنگم پر کھڑا تھا تو اقبال ایک ایسے زمانے میں منصۂ شہود پر آئے جب یہ نوآبادیاتی سرمایہ داری عہد اپنے انتہائے کمال تک پہنچ کر زوال آمادہ ہو چکا تھا اور تاریخ انسانیت میں اجتماعیت کے نئے دَور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حصّہ اپنے زمانے کے انہی عظیم معاشرتی انقلابات کی تفسیر ہے۔

غالب اور اقبال کی شاعری کا موازنہ کرتے وقت بعض اصحاب ان دو مثالی شاعروں کے کلام اور شخصیت میں تفریق و تخصیص اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ ایک میں داخلیت ہے اور دوسرے میں خارجیت' یا ایک میں احساسات اور جذبات کا ارتکاز ہے اور دوسرے میں منطقیت اور استدلال کی فراوانی، ایک دروں بینی اور خود نمائی میں محو ہے اور دوسرا دنیا اور کائنات کے رموز کو آشکارہ کرنے میں مصروف ہے، ایک کا شعر خود اپنا مقصد آپ ہے اور دوسرے کا شعر اپنے آپ سے الگ اور ماورا، ایک اخلاقی اور معاشرتی مقصد کا ذریعہ ہے۔

ان دو حیرت ناک حد تک مماثل شاعروں میں اتنی واضح اور دو ٹوک تفریق و تخصیص کی نشاندہی ایک نصابی اور مدرسانہ ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ تو ہو سکتی ہے لیکن سخن کی اس روایت کو سمجھنے

میں ہماری مدد نہیں کر سکتی جس کا یہ دونوں حصہ ہیں اور وہ روایت ہے فکری شاعری کی: جس کا اوّل و آخر مقصد حیات و کائنات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ اِس روایت میں داخلیت اور خارجیت کی کیفیات متضاد ہونے کے باوجود باہم پیوست یک آہنگ اور متحد ہوتی ہیں اور رہی ہیں۔ تمام شاعروں میں ان کے اجزا مختلف مقداروں میں بقدرِ حوصلہ و ظرف بیک وقت پائے جاتے ہیں انہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غالبؔ کے شعر میں جو ایک اندوہ گیں ٹھہراؤ، ایک سُلگ سلگ کر راکھ ہوتے جانے کی کیفیت ہے، وہ محض شخصی یا ذاتی یا اندرونی نہیں ہے بلکہ اس کے زمانے، اس کے گرد و پیش کی ٹھہری ہوئی معاشرتی صورتِ حال کا عکس ہے، اتنا ہی خارجی جتنا کہ داخلی اقبالؔ کے یہاں اس کے برعکس ایک پُر امید حرکت اور شعلہ جوّالہ کی کیفیت اس کے اپنے زمانے، اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کی سچائی ہے اور یہاں بھی داخلیت اور خارجیت باہم پیوست ہیں متحد ہیں۔ اقبالؔ اور غالبؔ دونوں کے یہاں جزو میں کُل اور کُل میں جزو ہر دیکھنے اور دکھانے کی بات ہے جس کی طرف غالبؔ نے اشارہ کیا ہے اور اُسے غایتِ سخن بتایا ہے۔ اسی قدرِ مشترک سے دونوں کے کلام کی ہم رنگی، دونوں کے خیال، جذبے اور احساس کی ہم آہنگی، دونوں کے شعری تجربے کی شدت اور ارتکاز جنم لیتے ہیں اور ان کو ہمارے شعر کی اس روایت کا حصہ بناتے ہیں جس کا تعلق اصلاً فکر سے ہے۔ محض ذاتی اور لمحاتی غموں اور خوشیوں سے نہیں ہے۔

ہمارے زمانے میں اس روایت کا سب سے مکمل اظہار فیضؔ کی شاعری میں ملتا ہے۔ یوں تو ترقی پسند ادب کی ساری تحریک ہی اس روایت کے نصب العین کو اپنانے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن فیضؔ میں جس طرح ایک مسلسل اور صبر آزما فنی ریاضت اور شدید ذاتی مجاہدہ کے ساتھ اس روایت سے منسلک رہنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے، وہ کہیں اور مشکل ہی سے پائی جاتی ہے۔

فیضؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے سلسلے کا شاعر ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں اور اکثر اس سلسلے میں اس کی کلاسیکیت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے اور اُس کو بہت حد تک اُس کے روایتی استعاراتی انداز میں اُس کے لغت کے چناؤ اور اُس کے ظاہری اسلوب سے عبارت سمجھا جاتا ہے۔ معاملہ اس سے ذرا گہرا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ فیضؔ کا بطور شاعر کے بنیادی مسئلہ اُس کی زندگی کا محور اُس کے لیے جزا و سزا کا پیمانہ یہ رہا ہے کہ اُردو کی شاعرانہ روایت میں داخل ہونے والا جدید عہد کا

شاعر کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔ اور وہ خود اس مثالی کردار کو کس طرح ادا کرے۔ یہ ایک بہت ہی مشکل معیار ہے جو اُس نے اپنے لیے اور اپنے عہد کے لیے قائم کیا تھا اور اس پر قائم رہنے کے لیے محض غزل کی ٹیکنیک سے واقفیت اور اپنے عہد کے واقعات پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت ہی کافی نہیں اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔

"دستِ صبا" کے دیباچے میں فیضؔ نے خود اس "بہت کچھ" کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے عہدہ برآ ہوتے رہنے کی اُس نے اپنی پوری زندگی میں کوشش کی ہے اور جس نے اس کی نسبتاً قلیل متاعِ سخن کے ایک ایک لفظ میں جادو بھر دیا ہے اور اس کے مصرعوں اور ترکیبوں کو اپنے زمانے، اپنی قوم اور دنیا بھر کے اُردو دانوں کے لیے ضرب المثل کی حیثیت دے دی ہے اور خود اس کو ہمارے جدید زمانے کے شاعر کا استعارہ اور "آرک ٹائپ" بنا دیا ہے۔ فیضؔ کی عالمگیر مقبولیت اور اُس کے کلام کی پُر اسرار کیفیت اسی "بہت کچھ" سے ہے۔

اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ فیضؔ نے اس فن کو دل لگی یا بے کار کام سمجھ کر اختیار نہیں کیا۔ وہ کہتا ہے "فنِ سخن (یا کوئی اور فن) بچوں کا کھیل نہیں ہے۔" اور یہ محض سنجیدگی یا خلوصِ نیّت ہی کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس کا تعیّن کرنا ہے کہ نیت کس عمل کی باندھی جا رہی ہے۔ "فنِ سخن بچوں کا کھیل نہیں ہے" اس کے لیے تو غالبؔ کا دیدۂ بینا بھی کافی نہیں۔ اس لیے کافی نہیں کہ شاعر یا ادیب کو قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔

تو اصل مسئلہ قطرے میں دجلہ دیکھنے اور دکھلانے کا ہے، اور یہیں سے فیضؔ کا فن، اُس کا طریقۂ کار مختلف اور منفرد ہو جاتا ہے۔ دجلہ سے فیضؔ کی کیا مُراد ہے، وہ اسی دیباچے میں درج ہے :

"دور دراز، اوجھل، دشوار گزار پہاڑیوں پر برفیں پگھلتی ہیں، چشمے اُبلتے ہیں۔" ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہمکنار ہوتے ہیں اور پھر یہ پانی گھٹتا بڑھتا وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے اس نے دجلہ کا کیا دیکھا۔ پھر شاعر کی نگاہ ان گذشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی گئی لیکن اُن کی منظر کشی میں نطق و لب نے یاوری نہ کی۔ یا اگلی

منزل تک پہنچنے کے لیے جسم و جاں جہد و طلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخرو نہیں تو" دجلہ" دراصل انسانی زندگی کی کُلّیت اور اُس کی تاریخ کا استعارہ ہے۔ یہ اور سوال ہے کہ غالب نے اُس سے کیا کیا مراد لی تھی لیکن فیض کی اپنی لغت میں اس سے انسانی تاریخ ہی عبارت ہے۔ ایک اور جگہ استعارے کی مدد بے بغیر اُس نے اِس آدرش کو یوں پیش کیا ہے:

"صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فنکار کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کی حدود میں اپنی ذات' اپنی قوم' اپنے عہد کے ماضی' حال اور مستقبل کو معلوم اور محسوس کرے اور اس کے بعد اپنے علم اور احساس کی قدر و قیمت معین کرے اور اُس کی تفسیر و تشہیر کرے۔"

یہ آدرش شاعر کے کام کو بیک وقت ایک مورخ' ایک سیاح' اور ایک فلسفی کی سطح پر بلند کر دیتا ہے' اور اس کام کو اُن سب کے مجموعی کام سے زیادہ زہرہ گداز اور جگر آزما بنا دیتا ہے' کیونکہ یہ محض خیال کو کسی نہ کسی طرح شعر کا قالب دینے کا نام نہیں بلکہ اس سارے تجربے کو بھٹی میں تپا تپا کر صاف کر کے' چھان پھٹک کے مقطر کر کے تصوری اور معنوی پیکر دینے کا نام ہے اور پھر اتنا بھی کافی نہیں کہا ہے:

"اگر غالب کے دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی اس دجلہ کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے اَن گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رُخ' اُس کے بہاؤ' اُس کی ہیئت اور اُس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑی ہے۔ یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اُس کی بینائی پر ہے۔ اُسے دوسروں کو دکھانا اُس کی فنی دسترس پر اُس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اُس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔ یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے ہیں۔"

فیض کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کے شاعرانہ آدرش کی ان تمام تفاصیل سے آگاہ ہونے کی ضرورت نہیں لیکن فیض کی شخصیت کی پہچان اور اُس کے لفظ لفظ کے پراسرار جادو کی سمجھ کے لیے ان باتوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے جدید

ادب (اور اس میں ترقی پسند ادب بھی شامل ہے) کے اُتھلے پن، سطحیت اور ناپائیداری کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے اور یہ بھی کہ اقبال کے بعد کے شاعروں میں سے خود فیض کو چھوڑ کر اور کوئی بھی کلاسیکل مرتبہ پر کیوں نہ پہنچ سکا۔

جدید ادب کے اُبھار کا زمانہ تیسری اور چوتھی دہائی کا وہ زمانہ ہے جو عالمگیر سرمایہ داری کے شدید ترین بحران، اس نظام کو بچانے کے لیے فاشزم کی تخلیق اور پھیلاؤ اور فاشزم کے وسیلے سے سوشلسٹ نظام اور سوشلزم کو جنگ کے ذریعے نیست و نابود کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔ یہ معاشرتی نظاموں کے مہیب ٹکراؤ اور ایک عالمگیر نئی معاشرتی قلب ماہیت سے پیدا ہونے والے اخلاقی اور رُوحانی تضادات کے فروغ کا زمانہ ہے۔

شاعر کی حیثیت سے اُس کے اَدرش کو متعین کرنے کے بعد ہم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ فیض اس نئی معاشرتی قلب ماہیت کے عمل سے کس طرح ہم آہنگ ہوا۔ دوسرے اکثر شاعر اس زمانے میں اپنی کاوش اور وقت ہیئتی اور اسلوبیاتی تجربوں پر صرف کر رہے تھے۔ اس طرح انھوں نے اُردو شعر کے اسلوب میں ایک انقلاب کی بنیادیں رکھیں۔ فیض نے بھی اس کام میں تھوڑا بہت حصہ لیا لیکن اُس کی اصل جدّوجہد کا میدان اور تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو پورے طور پر اس عظیم معاشرتی، انقلابی عمل سے پیدا ہونے والی اخلاقی اور رُوحانی کشمکش اور کیفیات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے وقف کر دیا جو ساری دنیا میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔

ایسا نہیں کہ دوسرے جدید شاعروں کے یہاں اس عالمگیر معاشرتی صورتِ حال کا شعور ہی نہیں تھا۔ فرق یہ ہے کہ جہاں اُن کی شاعری میں یہ شعور بالواسطہ فروعی اور ہنگامی ہے۔ فیض کے یہاں یہ براہِ راست نفس الامری اور اندرونی ہے۔ یہی اُس کے شعری تجربے کا سَت ہے۔ اُس کا حقیقی موضوعِ سخن۔ وہ ان کیفیات اور واردات کی نقش گری کرتا ہے جو ایک معاشرتی انقلاب کے طوفان کے دَوران انسانوں پر گذرتی ہیں۔

فیض احمد فیضؔ کی شاعری میں عالمی کلچر کے اجزاء

صلاح الدین حیدر

فیض کی شخصیت میں عالمی کلچر کے اجزا کچھ اس طرح باہم پیوست ہیں۔ کہ ان کی شاعری اور فن مختلف رنگوں کو منعکس کرتے ہوئے ایک نئے جہان کی خوب صورت تعمیر کے خواب اجاگر کرتے ہیں۔ ان رنگوں میں نمایاں رنگ تو "ہند عجمی" روایت کا ہی ہے۔ جس پر ایک نظر امین مغل صاحب نے بھی ڈالی ہے۔ اور اس کی کڑیاں میر و غالب کی روایت سے پیچھے کو لوٹتے ہوئے قدیم مادری سماج کی گیتوں کی روایت سے بھی جا ملتی ہیں۔ اور یہ عرب ایران کے قصیدے کے اس جزو میں بھی ایک نئی لہر ہے۔ جسے تشبیب کا نام دیا گیا۔ وہ اپنے عصر کے حوالے سے ایک غنائی ترنگ کے باوصف شیلے ورڈز ورتھ کی رومانوی لہر اور براؤننگ کے مانو لاگ سے بھی مانوس ہیں۔ حسن اور فطرت کو اپنی داخلیت کے آہنگ میں پیوست کر کے تصویریں ابھارتے ہیں۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو وہ عالمی شاعری کے افق پر پیدا شدہ جدیات کے اس رویے سے بھی اپنی ذات کو مغلوب کرنے پر مجبور ہیں۔ جس کے لئے شاعری کے ذیل میں محمد درویش ناظم حکمت پبلو نرودا اور لورکا کے نام لیے جا سکتے ہیں، فیض موسیقی کی مشرقی روایت سے بھی گہرے مانوس ہیں۔ اور قافیہ آہنگ کو بھی شاعری کا جزو سمجھتے ہیں۔ وہ صوفیا کے مسلک کی سچائی سے بھی اپنے آپ کو بہت قریب پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بہت سے رنگوں کے پیش نظر قدرتی امر ہے فیض کی شاعری کے مختلف اجزا کے بارے میں سوالات اٹھائے جائیں۔ اس ذیل میں بہت عرصہ پہلے عرش صدیقی صاحب نے فیض کی شاعری میں رومانوی عناصر پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے نہ صرف رومانوی عناصر بلکہ کئی حوالوں پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بعض ادبی رسائل کے خصوصی نمبر تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ افکار نے بھی ایک عرصہ پہلے فیض نمبر شائع کیا تھا جاوید اور سلمیٰ صدیقی نے بھی ان کے لئے فن و شخصیت نمبر چھاپا تھا۔ مرزا ظفر الحسن اور ایوب مرزا کی کاوشیں علیحدہ اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ فیض کے پورٹریٹ کو جوڑنے کے لئے ہر فریم میں کوئی نہ کوئی فرق رہ جاتا

ہے - اور فیض کسی خاص چوکھٹے میں فٹ نہیں آتے اس کی وجہ یہ ہے کہ فیض جس مسلک عشق کے آدمی ہیں - خود اس کے تجربے سے پوری طرح ایمان لے آتے ہیں - ان کے اسلوب میں ایک ہمہ گیر قوت فیصلہ ہے - جس کی ادب فلسفے اور آگہی کے میدان میں بہت پہلے بنیادیں استوار رہی ہیں - یعنی وہ نیکی اور بدی یا ظلمت یا روشنی کی آویزش کے شاعر ہیں اور حق و باطل کی جنگ میں وہ کسی طرح باطل سے صلح کرنے پر تیار نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ فیض یہ بات بھی بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مشکل راستہ ہے - اور تخلیق عمل کے پرپیچ سفر میں یہ آگ میں پھول کھلانے کا راستہ ہے - آگ اور پھول کی جنگ ادب سے تخلیق عمل میں ناگزیر ہے اور جتنی زیادہ آگ پھیلتی ہے - اسی قدر شاعری کے پھول نمو پاتے ہیں - حیات کے تصادم کا یہ عمل یوں تو قرنوں اور صدیوں سے جاری ہے - لیکن فیض کے دور میں اس مسلک عشق پر نقد و نظر کے زاویے زیادہ روشن اور نمایاں ہوئے ہیں - اور زیادہ تر بڑے فن کاروں کی توجہ اس سوال پر مرکوز ہوئی ہے - کہ انسانیت کو لوٹ کھسوٹ جنگ پرستی فسطائیت اور نو آباد یاتی نظام کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرایا جائے غزل جو کہ معاشری جبر کے رد عمل کو غم کے تجربے کی خصوصیت کے ساتھ قافیہ و ردیف کے آہنگ میں نمایا کرتی رہی ہے کے نئے امکانات ابھرے ہیں - لیکن یہ سوال اپنی جگہ پھر بھی اہم ہے کہ کیا ذاتی غم کے تجربوں سے ہٹ کر بڑی شاعری نہیں ہو سکتی؟ فیض غم جاناں اور غم دوراں کو ایک ہی سلسلے کی کڑی قرار دیتے ہیں - لیکن زندگی کی معروفی روزگاہ بھی بڑے ادب کی تخلیق کے لئے زیادہ وسیع امکان مہیا کرتی ہے - لیکن کیا ذاتی غم بھی انسانیت کے اجتماعی تجربے سے علیحدہ ہوتا ہے؟ اس ذیل میں فیض دست صبا کے دیباچے میں غالب کے حوالے سے لکھتے ہیں - کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی - دیدہ بینا نہیں بچوں کا کھیل ہے - سادہ لفظوں فیض جزو کو کل سے علیحدہ نہیں سمجھتے - یعنی وہ انسانوں کے انبوہ کو بے معنی نہیں جانتے - کسان کی پک کا دجیوں میں اڑنا کنڈریوں اور محلوں آنچلوں کی حنا اور چوڑیوں کی کھنک ریل بانوں تانگے بانوں پوسٹ مینوں کی محنت کو بے معنی خیال نہیں کرتے -

بلکہ سب محنت کرنے والوں کی قوت کو کلچر کی تعمیر کا اصل راز سمجھتے ہیں - ان تمام باتوں کے باوصف اپنے رویے کے اعتبار سے بنیادی طور پر کلچر کے آدمی ہیں - اور کلچر کی جو روایت بھی مل ہے وہ اس کے خوب صورت اجزا کو تخلیق فن کے سفر میں ناگزیر جانتے ہیں - وہ غالب کی روایت سے تخیل کے فانوس کی شمعیں جلاتے ہیں - اور کالاقادر کے ایک معمولی کسان کے تجربے کو بھی اپنے احساس کا حصہ بنا لاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ غیر معمولی قوت احساس کی وجہ سے ہی بڑے شاعر ہیں - اور شاعری کی سطح پر وہ رد عمل

کی تیسری سمت یعنی مغائرت کے راستے پر قیام نہیں کرتے بلکہ اس پہر دن میں وہ پھر زندگی کے رابطوں سے جا ملتے ہیں ۔ گو احساس تنہائی ان کے تجربے کا حصہ ہے لیکن یہ صورت حال عارضی ہے اور کارگاہ حیات میں اپنے مسلک پر اعتماد ان کی آنکھوں کو روشن کر دیتا ہے ۔ چنانچہ بیروت کی رزمگاہ میں ان کا احساس مرنے اور زخمی ہونے والوں کے بچوں کا ترجمان بنتا ہے ۔ اور فلسطینیوں کا لہو ان کے قلم سے ترانہ بن کر فتح کا نشان بن جاتا ہے ۔ فیض کے ناقدوں کی ایک رائے یہ بھی تھی کہ فیض کی تشبیہیں اور استعارے روایت سے ایک خاص عمر اور رحلت تک نئے دور کے تجربوں کو بیان کر سکتے ہیں ۔ لیکن یہ ناقد فیض کے ذہن کے عناصر کو قریب سے نہیں دیکھ سکے ۔ فیض کی شیلی کے اسلوب میں ہمیشہ حق کے راستے کو سمجھنے میں مصروف کار رہتے اور پھر اسی لہر سے ہر بار اپنے تن بدن کی دھجیوں سے نیا پھریرا بنا لاتے فیض کے عہد بنیادی خواب اب کسی ایک علاقے کے مخصوص تہذیبی قرینے سے متعین نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ فیض کے عہد میں اجتماعی شعور کی سطح اور انسانی رابطوں کی سطح گزشتہ ادوار کی نسبت بہت مختلف اور تیز رفتار ہی ہے ۔ اب کوئی باشعور آدمی ان راستوں سے بے پرواہ نہیں رہ سکتا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایبسرڈ رویے کے ساتھ روایت کی نفی بھی خودکشی کا راستہ ہے ۔ فیض اپنے سفر کے دوران بلاشبہ اپنی ذمہ داری سے آگاہ تھے :۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیض

شخصیّت فیض کی عظمت کی اساس

تحریر: ڈاکٹر انوار احمد

فن کی تفہیم و تحسین میں فن کار کی شخصیت کو مرکزی حوالہ بنانے کے خلاف بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ تخلیق عمل کے دوران فن کار کرتا ہے یا رفعت و بالیدگی سے ہم کنار ہوتا ہے اس طرح اس کی رسمی ذات اور تخلیقی وجود کے مابین، تخلیقی لمحات میں فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یوں اس لمحے کی سچائی کا عکس فن کار کی رسمی ذات میں تلاش کرنا، کار عبث ہے۔ حالاں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ریاضت تہذیب و تربیت اور اکتساب کے بعد بھی کوئی رسمی ذات، شخصیت کے رتبے پر فائز ہوتی ہے۔ دوسرے تخلیقی عمل کے دوران فن کار جس فکری و حسیاتی بالیدگی اور وجدانی رفعت سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ اس کی شخصیت کا جزو بن جاتی ہے۔ دگرنہ اس میں اور پارسائی کے اس جبے میں کیا فرق رہ جائے گا۔ جو منبر پر جلوہ افروزی کے وقت اوڑھ لیا جائے۔ تیسرے ہر وہ فن کار جو اجتماعی زندگی میں صداقت، حسن اور نیکی کی روشنی میں پھیلانے کا دعوہ کرتا ہے۔ جو شرف آدمیت، انسان دوستی سماجی انصاف کی عالم گیری کا خواب دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ اور وہ اگر اپنی سماجی زندگی میں ریاکار، کم ظرف۔ کم حوصلہ اور مردم آزار ہو تو اس کے فن کار کی اثر پزیری معلوم!

کسی بھی شخصیت کو عظیم قرار دینے والے پر یہ واجب ہے کہ وہ یہ وضاحت کرے کہ اس کے نزدیک عظمت کا معیار کیا ہے؟ کیا وہ کسی ماورائی یا غیر ارضی اوصاف کے حامل کسی فرد کو عظیم خیال کرتا ہے؟ کیا وہ عظمت کو کسی خاص زمانے سے مشروط خیال کرتا ہے؟ کیا وہ عظمت کو وہبی شے خیال کرتا ہے؟ اور کیا عظیم افراد کسی خاص طبقے میں ہی پیدا ہوتے ہیں؟ میرے نزدیک اس سلسلے کے آخری چار سوالوں کا جواب ایک بلند آہنگ نہیں ہے، نام نہاد شرفا کی خود فریبی کا وہ دور ختم ہوا جب بالائی طبقے کو عظمت بشر کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح کوئی فن کار ماورائی اور غیر ارضی اوصاف کی بنا پر عظیم نہیں ہو سکتا۔ پھر عظمت کا معیار کسی خاص زمانے کی نسبت سے ادلتا بدلتا نہیں۔ کیوں کہ انسانی سماج کے ارتقا کے باوجود حسن، نیکی، سچائی اور آزادی وہ بنیادی

اقدار ہیں ۔ جن سے ہر دور میں عظمت بشر کا تصور منسلک ہے ۔ اور یہ بھی کہ ریاضت، تہذیب، وتربیت اور اکتساب کے بعد ہی انسان اپنے فطری جوہر کو نکھارتا اور سنوارتا ہے :۔

فیض کی پوری زندگی، پورا وجود، سارے لفظ، سارا عمل اس کی گواہی دیتا ہے کہ وہ ہمارے عہد کی ایک عظیم شخصیت تھے ۔ کیونکہ زندگی میں ان کا طرزِ عمل اور رویہ انہیں قدروں کا آئینہ دار تھا ۔ جن سے ان کا عہد استوار تھا ۔ شاعروں اور فن کاروں سے ناقدری عالم کا گلا اکثر سننے میں آتا ہے اور اس کا شاید جواز بھی ہے مگر فیض نے اسیری میں بے روزگاری میں، کفر اور غداری کے فتووں میں طعن وتشنیع کے ماحول میں جلاوطن کے ایام میں کبھی ناقدری عالم کا گلہ نہیں کیا ۔ نہ بے مہر زمین سے جنم لینے پر تاسف کا اظہار کیا، نہ ذرائع ابلاغ اور سرکار دربار کے آنکھیں بدلنے پر ملول ہوئے ۔ انہوں نے شکایت کی تو صرف یہ کہ ؛ ۔

"ہمیں شکایت یہ ہے کہ جس قدر لطف اور عنایت اور خلوص اور محبت سے اہل وطن نے اور اپنے دوستوں نے جو اپنے وطن میں نہیں ہیں ہمیں نوازا اور سرفراز کیا ہے اس کی وجہ سے ہمیں ندامت ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں تھے :"

یہ بھی ناقدری عالم کا گمان یا اندیشہ ہوتا ہے جو فن کاروں کو خود نمائی کے مضحکہ خیز اطوار اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔ اپنی دستار فضیلت کو رجسٹرڈ کرانا پڑتا ہے ۔ اپنے تصوفن اور تصور حیات کو دھاجت یہ انداز اشتہار کرنا پڑتی ہے ۔ اپنے بارے میں باتیں، اپنے آپ سے باتیں پسند کی جاتیں ہیں ۔ مگر فیق سے آشنا سبھی جانتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں انکسار کس درجے کا تھا ۔ اور انہیں اپنے بارے میں باتیں کرنے سے کس قدر وحشت ہوتی تھی بلکہ وہ شعر اور نثر میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرنے سے گریز کرتے اور معصومانہ انداز میں "ہم" کہتے دکھائی دیتے ہیں ؛۔

"اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے ، بلکہ میں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا اور میں کی بجائے ہمیشہ ہم لکھتا آیا ہوں :"

لیکن اس انکسار کا مطلب سپر اندازی نہیں، جو مقام انا کے اعلان اور حفظ خودی کا تھا، اس سے غافل نہ تھے، چنانچہ ایک خط میں اپنی بیٹی منیزہ کو لکھتے ہیں "ہم اب بھی امیروں، وزیروں کو پاؤں کی دھول سمجھتے ہیں، اصل تسلی کی بات تو اپنے علم و ہنر کو ہے :"

اسی زمانے میں سب نے دیکھا کہ تنگ نظری کے مسلح محافظوں نے کون سی تہمت اور کون سا سنگ دشنام فیض کی جانب نہ اچھالا مگر فیض نے اس روش کے بدلے میں ہمیشہ عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا، اخلاقیات سے متعلق ان کا تصور تھا "اگر کسی کا عقلی یا آسمانی احکامات پر ایمان نہ ہو تو نیکی اور اخلاق کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو لمحہ حق وصداقت کی پرورش میں گزرے، وہ بجائے خود خوشی کا ایسا خزینہ بن جاتا ہے، جسے کوئی رہزن لوٹ نہیں سکتا، نہ کوئی جابر ضبط کرسکتا ہے، شاید مذہبی اصلاح میں توشہ آخرت کے صحیح معنی یہی ہیں۔"

فیض کی حیات اور فن کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ انہیں حافظ کا یہ شعر کس قدر پسند تھا:-

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

چنانچہ ان کی پوری زندگی انسانوں اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں میں صرف ہوئی، جیل سے ایلس کے نام لکھے گئے خطوط میں سے دو اقتباسات دیکھئے:-

"اس اجتماعی دکھ درد کے علاوہ، جو صرف معاشرتی انقلاب ہی سے دور ہو سکتا ہے، انفرادی رنج وملال کے ایسے اسباب بھی بہت ہیں، جو تھوڑی سی محبت، شفقت اور سمجھ بوجھ سے اگر دور نہیں کئے جا سکتے تو کم ضرور کئے جا سکتے ہیں۔"

"ہمارے دوست سرجیت سنگھ نے کہا تھا:

اگر وہ یہاں ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ اس کے صحیح معنی کیا ہیں، اب مجھے طور پر پتہ چلا ہے کہ اگر اپنے دل میں جرم وگناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب اور دکھ درد سب مفارقتیں، سب سختیاں، سب صعوبتیں غرض وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، جو باہر سے اس کی ذات پر نازل ہوں، صرف گناہ کا احساس، خطاکاری کا احساس یا اپنے آپ سے دغا کرنے کا احساس ایسی چیز ہے، جس کا کوئی مداوا، کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔"

اجتماعی زندگی کو تعطل اور انسانی ایمان کو تذبذب سے دوچار کرنے والی قوت کے مقابلے میں امید کا دیا جلانا اور اس کی حفاظت کرنا غیر معمولی کارنامہ ہے، جو فیض نے سر انجام دیا، حافظ شیرازی نے کہا تھا:-

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

قفس میں بلکہ موت کے سائے میں رہ کر بھی فیض کو یقین ہے کہ "اگر آج کا دن موجود ہے، تو کل کا دن بھی برحق ہے۔ اسی طرح ہر دکھ بھرا دن جو گزرتا ہے، اپنی تسکین اپنے ساتھ لاتا ہے، یہ تسکین لاتا ہے کہ جو دن گزر چکا ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکا اور اس کے بعد جو بھی دن آئے گا، اس سے مختلف ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بہتر ہو، اس لئے لازم ہے یہی ہے کہ آنے والے دنوں پر نظر جمائے رکھیں اور بیتے دنوں کو جملہ ساکنان عدم کے ساتھ دفن ہو جانے دیں۔"

اگر ہم غور سے دیکھیں تو فیض کی شخصیت اور فن کی اساس بے کراں اور عالم گیر محبت پر ہے اور اس سے یقین اور آرزو کا چراغ جلتا ہے اور یہی سب سے بڑا سچ ہے اور اس کی قیمت ادا کرنا دہ مجاہدہ ہے۔ جسے فیض نے شاعری کے لئے ضروری قرار دیا۔

"تھوڑا بہت جو ہم نے کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولیں، زندگی میں غالباً کبھی کبھار تو یہ مجبوری تو ہو جاتی ہے کہ آدمی سچ نہ بول سکے، لیکن اس پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ جھوٹ بولو۔ دوسری کوشش یہ کی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ کہیں جس کی وجہ سے اپنے آپ پر یا کسی دوسرے پر اخلاقی طور پر کوئی حرف آئے، تیسرے یہ کہ لوگوں سے محبت کی ہے، سب سے۔"

❦

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

فیضؔ

فیض کا نظریۂ فن

نعمت الحق

انسان حیوان سے اشرف ہے کہ زندگی کا شعور رکھتا ہے۔ یہ شعور کی قوت ہی ہے جس کی بدولت انسان نظامِ زندگی کی تفہیم کر کے ایک نظریہ حیات وضع کرتا ہے۔ یوں تو ہر شخص زندگی کے بارے میں خاص نقطہ نظر رکھتا ہے جس کا اظہار اس کے رویوں سے ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اپنے مقصدِ حیات کا شعور ہی نہیں ہوتا یہ اطاعت ہی کو اپنا فرض سمجھتے ہیں ایسے بھی لوگ ہیں جو اپنے میں زندگی کا ایک خاص نصب العین رکھتے ہیں لیکن ان کے شب و روز اپنی ہی ذات کے تنگ دائرے میں اسیر ہوتے ہیں ان کا COMMITMENT ایک مخصوص اقلیتی طبقے سے ہوتا ہے اور اسی سے ان کا مقصدِ حیات منسلک ہے۔ ایسے لوگ شعور کی دولت سے یکسر محروم ہیں۔

بڑا شاعر زندگی کا گہرا شعور رکھتا ہے اس کا نظریہ حیات اس کے COMMITMENT سے وابستہ ہوتا ہے جس کا تعلق اس کی ذات سے ہوتا ہے نہ کسی ایک فرد سے اور نہ ہی کسی مخصوص اقلیتی طبقے سے۔ بلکہ اس کا COMMITMENT اپنے عہد سے ہوتا ہے۔ فیض کا COMMITMENT بھی اپنے عہد سے ہے اس لئے وہ اجتماعی محبت کا قائل ہے۔ اس محبت کا جو انسان کو انسان سے ہوتی ہے۔ جو فرد کو اجتماعی غم میں شریک کر لیتی ہے۔ فیض اس محبت کا قائل ہے جو فتح مندی ہی میں نہیں۔ شکست خوردگی میں بھی ہے فیض مفتوح کے ساتھ شریک ہونا بھی جانتا ہے۔ اسی لئے ہزیمت زدہ لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کا جذباتی ہمزاد محض ایک فرد نہیں بلکہ اجتماع ہے:۔

فیض ایک فرد یا ایک مخصوص اقلیتی طبقے کے لئے خوب صورتی نہیں چاہتا وہ زندگی کے حسن کا خواہاں ہے۔ وہ حسن کو اپنی آنکھ تک محدود نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ سب انسانوں کے لیے خوشیوں کا متلاشی ہے فیض ساری دنیا کو جہالت، غربت، دکھ، افلاس اور غلامی سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی شاعری بھی خواب نہیں ہے۔ اجتماعی خواب ہے۔ اس کی شاعری مقصود بالذات نہیں بلکہ اس کے سماجی ولولے کے ابلاغ کا وسیلہ ہے یوں اس کے موضوعات نجی معاملات کی بجائے زندگی کی کشاکش سے متعلق ہیں:۔

انسانی زندگی کا سفر امکانات کا سفر ہے۔ اور یہ امکانات معین نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں یقین کے ساتھ۔

کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا، لیکن جو لوگ اپنے عہد سے COMMITMENT کر لیتے ہیں انہیں یقین کی یہ دولت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اسی یقین یا CONVICTION کے سہارے زندگی کے بہت سے امکانات کو دیکھ سکتے ہیں۔ انہیں اپنے اجتماعی خواب کے سچے ہونے کا بھی کامل یقین ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جو سوچتے ہیں اور جس اجتماعی خوشی کی تمنا کرتے ہیں۔ اس کے حصول کے وسیلوں پر اعتماد رکھتے ہیں اس لیے ان کے یہاں مسلسل عمل اور جدوجہد کا درس ملتا ہے۔ فیض کا سماجی وعدہ موجود اور آنے والے انسانوں سے ہے۔ اسی سماجی وعدے کے نتیجہ میں یقین کی جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ اجتماعی جدوجہد کا درس دیتی ہے اس اجتماعی جدوجہد کی منزل زندگی کی خوب صورتی ہے۔ حسن ہے۔ حسن جو تناسب کا نام ہے۔ زندگی کا حسن نیکی، صداقت، آزادی اور عدل کی صورت میں ہے۔ فیض زندگی کو اس بدصورتی سے جو غلامی، جہالت اور ناانصافی کی صورت میں ہے نجات دلانا چاہتا ہے اور اسے اپنے اس خواب کی سچائی پر یقین ہے:۔

فیض کا تصور فن اس کے تصور حیات کا پرتو ہے۔ فیض کے نزدیک زندگی کو کلی طور پر شاعری میں موجود ہونا چاہیے اور اس کی شاعری میں زندگی کلی حیثیت سے اپنی تمام تر جذبات کے ساتھ موجود ہے۔ رنگ پیراہن، خوشبو، خمار شباب، پیشانی و رخسار اور اس کے ساتھ خاک میں نہلائے ہوئے بدن۔ بازار میں بکتا ہوا مزدور کا گوشت، شاہراہوں پر بہتا ہوا غریب کا لہو، رستے ہوئے پھوڑے، نیلام ہوتے گراز جسم اور زندہ پستوں کے بن کا ذکر بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ آیا ہے، اس کی شاعری میں زندگی کی تصویر اپنے ہر نقطے۔ ہر لکیر اور ہر رنگ کے ساتھ موجود ہے۔ فیض کو زندگی کا ادراک حاصل ہے۔ اسے حال کے ساتھ ماضی کا شعور بھی ہے اسی لئے وہ آنے والے زمانے کی بات کر سکتا ہے۔ وہ ماضی و حال کا تجزیہ کرنے کے بعد مستقبل کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں زندگی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس میں حال کا نقش بھی ہے اور مستقبل کے امکانات بھی ہیں اس لئے اس کے یہاں "زندگی جیسے ہونا چاہیئے" کا تصور موجود ہے اور یہیں وہ ان قوتوں کے خلاف مزاحمت کا سبق دیتا ہے جو زندگی کے نصب العین یا آدرش کے حصول میں رکاوٹ ہیں فیض کی مزاحمت ایک فرد کے خلاف نہیں اس طرز حیات یا کے خلاف ہے جو شرف آدمیت کی بحالی، عدل اجتماعی، مساوات اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کرتا:۔

فیض نے اپنے نظریہ حیات اور نظریہ فن کی توضیح "دست سر وادی سینا" میں شامل نظم انتساب میں کی ہے وہ اپنی شاعری کو آج اور آج کے غم کے نام کرتا ہے اور اپنے اس دیس کے نام کرتا ہے۔ وہ

کلرکوں، پوسٹ مینوں، تانگے والوں اور ریل بانوں کے لئے شعر کہتا ہے۔ وہ اپنا فن کارخانوں کے بھوکے جیالوں اور اس دہقاں کے نام کرتا ہے۔ جو بادشاہ جہاں ہے، جو دھرتی سے اناج اور عورت سے اولاد پیدا کرتا ہے لیکن اس کا اناج اور اولاد سرکار اور پٹوار آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور تپتی دھوپ میں پھرتے تین بیل دھرتی کا سینہ چیرتے نظر آتے ہیں۔ فیض شاعری کرتا ہے بلکتے بچوں کی ان دکھی ماؤں کے لئے جن کی بانہیں لوگوں کے نیزوں کو جھولا جھلا رہی ہیں۔ اور ان حسیناؤں کی منتظر آنکھوں کے لئے جن کے سہاگ کارخانوں کی چمنیوں کا دھواں بن گئے ہیں اس کے شعر ان طالب علموں کے نام ہیں جو علم کی روشنی حاصل کرنے کی لگن میں نکلے لیکن SYSTEM کے گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے انہیں نگل گئے۔ فیض کا فن ان اسیروں کے نام ہے جن کے سینوں کے زخم کل کی امید کا ستارہ بن گئے ہیں اور آنے والے دنوں کے ان سفیروں کے نام ہے جن کے پاس صبح آزادی کا پیغام ہے:۔

فیض اپنے وطن کے لیے ہی نہیں دنیا کے ہر اس خطے کے لیے جہاں غلامی کی اندھیری رات کا بسیرا ہے صبح آزادی کا خواہاں ہے:۔
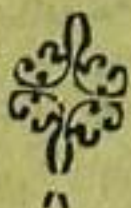
مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و نفرت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی، جس کی تلقین اب سے بہت پہلے حافظ نے کی تھی۔

فیض

ایلس کے فیض سے باتیں

فیض احمد فیض
ایک انٹرویو

اقتباسات — طاہر مسعود

اقتباسات : نصرت چودھری

فیض کی ایلیس سے — امرتا پریتم کی باتیں

امرتا پریتم

امرتا : ایلیس! کیا فیض صاحب سے تمہاری پہلی ملاقات تمہارے ہی دیس انگلستان میں ہوئی تھی؟

ایلیس : نہیں، میری بہن ہندوستان بیاہی تھی، ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ۔ وہ دونوں لندن میں ملے تھے، البتہ ۱۹۳۸ء میں اپنی بہن سے ملنے ہندوستان آئی تھی۔

امرتا : تو ہندوستان کو تم نے فیض کے روپ میں دیکھا۔

ایلیس : ہاں، امرتسر میں ملی تھی۔ امرتسر ہندوستان بن گیا اور ہندوستان فیض۔

امرتا : تم اردو نہیں جانتی تھیں، پھر فیض کی شاعری سے عشق کیونکر ہوا؟

ایلیس : امرتا سچی بات تو یہ ہے کہ میں آج تک فیض کی شاعری کی گہرائی کو نہیں جان سکی۔ ذرا سا زبان کو سمجھ لینا اور بات ہے لیکن پوری تہذیب کو جاننا اور بات ہے۔

امرتا : تب فیض شاعر سے نہیں ایک شخصیت سے پیار کیا تھا؟

ایلیس : ہاں، لیکن ویسے تو شاعری شخصیت کا ایک حصہ ہوتی ہے کیونکہ ایک شاعر کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہوتی ہے اس لیے بھی اس کا بہت کچھ جاننا ہوتا ہے اور میں نے جانا۔

امرتا : ملنے سے کتنے عرصہ بعد شادی کی منزل آئی۔

ایلیس : تقریباً دو سال بعد۔ اور یہ انتظار اس لیے تھا کہ فیض کے والدین سے منظوری چاہیے تھی، کیونکہ ایک خوش گوار ماحول کے بغیر ہم شادی نہیں کر سکتے تھے۔

امرتا : شادی کی رسم کہاں ادا کی گئی؟

ایلیس : کشمیر میں۔ مہاراجہ کشمیر نے اپنا گرمیوں کا محل ہمیں نکاح کی رسم کے لیے دیا تھا اور شیخ عبداللہ نے نکاح کی رسم ادا کی تھی۔

امرتا: کیا بارات لاہور سے آئی تھی؟

ایلس: ہاں۔ تین آدمیوں کی بارات تھی۔ ایک فیض، دوسرے ان کے بڑے بھائی اور تیسرے ان کے دوست نعیم ــــ جب تینوں آ گئے تو میں نے فیض صاحب سے پہلی بات پوچھی ــــ "بیاہ کی انگوٹھی لے کر آئے ہو کہ نہیں؟"

فیض نے کہا: "انگوٹھی بھی لے کر آیا ہوں، ساڑھی بھی۔"

میں حیران ہو گئی کہ فیض نے انگوٹھی کا سائز کہاں سے لیا ہے۔ پوچھنے پر کہنے لگے: "میں اپنے سائز پر لے آیا تھا۔"

امرتا: فیض جان گئے ہوں گے کہ دل مل جائیں تو انگلیاں بھی ضرور مل جاتی ہیں۔ اچھا ایلس! یہ بتاؤ نکاح کے وقت مشاعرہ بھی ہوا تھا؟

ایلس: ہاں ہوا تھا۔ پہلے کھانا شیخ عبداللہ اور ان کی بیوی کے ساتھ کھایا، پھر مشاعرہ ہوا۔ مجاز اور جوش ملیح آبادی بھی تھے۔

امرتا: فیض کے رشتہ داروں سے کب ملاقات ہوئی؟

ایلس: کشمیر میں تین دن ٹھہر کر ہم لاہور آ گئے۔ وہاں دعوتِ ولیمہ کی گئی۔

امرتا: یہ تو ہندوؤں کے مکلاوے کی رسم ہوتی ہے۔

ایلس: ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ لڑکے والوں کی طرف سے یہ دعوت کی جاتی ہے۔

امرتا: ساس کی بزرگانہ دعائیں کیسے لیں؟

ایلس: سر جھکا کر گھونگھٹ نکال کر۔

امرتا: ایمان سے سچ! گھونگھٹ اٹھانے کی رسم بھی ہوئی تھی؟

ایلس: ہاں امرتا! چاندی کے روپوں کی سلامی ملی تھی۔

امرتا: ساس صاحبہ نے تمہارا نام نہیں تبدیل کیا؟

ایلس: کیا تھا، اور انھوں نے میرا نام کلثوم رکھا تھا۔ لیکن مجھے پسند نہیں آیا۔

امرتا: اردو زبان کب سیکھی؟

ایلس: گھر میں فیض کے بھتیجے سے، ان کو انگریزی سکھائی اور ان سے اردو سیکھی۔

امرتا: اس وقت تک فیض کا پہلا مجموعہ "نقشِ فریادی" چھپ چکا تھا؟

ایلس: ہاں، شاید ایک سال پہلے چھپا تھا۔

امرتا: فیض نے اپنے پہلے عشق کی داستان سنائی تھی جس کے متعلق "نقشِ فریادی" کی نظمیں لکھی تھیں؟

ایلس: ہاں امرتا! وہ بھی اور اس کے بعد کی دوستیاں بھی۔ لیکن کچھ بھی میری زندگی پر اثر انداز نہیں ہوا۔ فیض ایک چٹان ہے اپنے آپ میں فیض کی وفا اپنے ساتھ ہے کاغذ اور قلم کے ساتھ ہے۔

امرتا: یہ سچ ہے، جس کی وفا اپنے ساتھ ہو، اپنے کردار کے ساتھ ہو، اپنی تخلیق کے ساتھ ہو اُس جیسا وفادار کون ہو سکتا ہے۔

ایلس: سینتیس برس گذر گئے ہماری شادی کو۔

امرتا: پورب اور پچھم کا یہ ملاپ کیسا رہا۔

ایلس: یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ دو مختلف علیحدہ علیحدہ سرزمینوں کے مرد و زن جب شادی کرتے ہیں تو میرا خیال ہے مرد کے لیے عورت کے دیس میں رہنا آسان نہیں لیکن عورت اپنے مرد کے دیس میں رہ سکتی ہے۔ نئی دھرتی، نئے ماحول کو اپنانے کی اس میں توانائی ہوتی ہے۔ مختلف تہذیب کے لوگوں کی شادی آسان بات نہیں۔

امرتا: تمہارے دو بچے ہیں۔

ایلس: دو لڑکیاں۔ سلیمہ اور منیزہ۔ سلیمہ مصوّرہ ہے اور منیزہ ٹی وی پروڈیوسر، دونوں نے دو پنجابی بھائیوں کے ساتھ شادی کی ہے، اس لیے اکٹھی رہتی ہیں اپنی ساس کے ساتھ۔

امرتا: ایلس! تم نے فیض کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہوگا؟

ایلس: نہیں، اور لوگوں نے کیے ہیں۔ تقریباً پانچ سال پہلے یونیسکو کی طرف سے ایک ترجمہ چھپا تھا۔

امرتا: فیض صاحب کو لینن پرائز کب ملا تھا؟

ایلس: ۱۹۶۲ء میں فیض کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ کچھ سنبھل چکے تھے لیکن ابھی بستر پر تھے جب پاکستان ٹائمز سے فون آیا تھا۔

امرتا: یہ خبر سن کر فیضؔ صاحب کے پہلے الفاظ کیا تھے؟

ایلس: وہ چُپ ہو گئے تھے۔ شاید دل بھر آیا تھا۔

امرتا: لوگوں کا کیا رویہ تھا؟

ایلس: یہ کہ فیضؔ کو یہ پرائز نہیں لینا چاہیے، لیکن ایوب خان کا تار آیا کہ وہ پرائز لے سکتے ہیں۔ اسی طرح ے اور تار بھی موصول ہوئے۔ پھر دوست مبارکباد دینے آ گئے۔ پھر سوال آیا کہ اس حالت میں فیضؔ ماسکو کا سفر کیسے کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ہوائی جہاز کے سفر سے منع کیا ہوا تھا، اس لیے بیٹی کو ساتھ لے کر فیضؔ نے گاڑی سے لاہور سے کراچی تک کا سفر کیا۔ پھر ... ری جہاز سے نیپلز تک اور نیپلز سے گاڑی کے ذریعے ماسکو تک۔

امرتا: ایلس! آپ نے کبھی فیضؔ بائیوگرافی لکھنے کے بارے میں سوچا ہے؟

ایلس: میں تو نہیں، البتہ کراچی میں ظفر الحسن لکھ رہے ہیں، لیکن سوچتی ہوں کہ فیضؔ کو خو... چاہیے۔ ایک اور کام ادھورا پڑا ہے۔ فیضؔ اور صوفی تبسّم مل کر پرشین شاعری ... کر رہے تھے، صوفی تبسّم کا انتقال ہو گیا تو فیضؔ بہت اُداس ہو گئے ___ وہ کام ... کرنے والا ہے اور یہ کام بھی۔ دونوں کام ضروری ہیں۔

امرتا: ہاں ایلس! اور ان دونوں سے بڑا ضروری کام فیضؔ کی زندگی کو بچانے کا ہے۔

ایلس: ہاں، اللہ اُن کی حفاظت کرے۔

❋❋❋
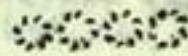
ایلس کے فیض سے باتیں

امرتا پریتم
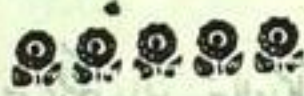
کمرے میں فیض بیٹھے ہوئے تھے۔ مطمئن اور پُرسکون اور ویسے تو وہاں کچھ بھی پُرسکون نہ تھا۔ کمرے میں آتی شام کی ہوا بھی نہ تھی۔ کیونکہ ٹی وی والوں نے میرے کمرے کی اگلی کھڑکیاں اس لیے بند کر دی تھیں کہ بیرونی سڑک سے ٹریفک کا شور کمرے میں آتا تھا۔ پچھلی کھڑکیاں اس لیے بند کر دیں کہ چڑیوں کی آواز آتی تھی۔ کمرے کا دروازہ اس لیے بند کر دیا تھا کہ اوپر سے ٹیلیفون کی آواز کسی وقت بھی آسکتی تھی۔ روشنی بھی پسند نہ تھی کیونکہ کیمرے کی آنکھ کو بڑی تیز روشنی درکار تھی۔ وہ خلوت بھی میسر نہ تھی جو کسی کے دل کی پہنائیوں میں اتر جانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ کمرے میں ایک پروڈیوسر بھی تھا۔ ایک نگہبان سرکاری افسر بھی۔ ایک کیمرہ مین اور ایک ساؤنڈ ریکارڈسٹ بھی۔

یہ بھی احساس تھا کہ جو بھی لفظ منہ سے نکلے گا وہ میز پر رکھے پھولوں کی اوٹ میں چھپے مائکروفون سے کل دنیا کے سامنے نشر ہو جاتا ہے۔

سو کتنی پابندیاں تھیں جن سے چل کر نکلنا تھا، اسی لیے میں نے فیض کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر ان کے ہاتھ کی گرمائش مانگی اور کہا۔

"کوئی بات کرو کہ گلشن کا کاروبار چلے۔"

فیض نے ساری قوت آنکھوں میں سمیٹ کر کہا۔ "ہاں کرو باتیں۔"

میں نے کہا۔ "داغستان کی ایک کہاوت ہے کہ شاعر دنیا کی پیدائش سے سو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ چاروں طرف عجب ویرانی ہوگی، سو اس نے اپنی دنیا بنائی ہوگی، اپنے تصور سے، اپنے تخیل سے، اپنے سپنوں سے۔"

"ہاں ضرور بنائی ہوگی۔" فیض نے حامی بھر لی۔

میں نے پھر کہا۔" وہ روایت آج بھی چل رہی ہے۔ شاعر کو ایک دنیا تو بنی بنائی ملتی ہے، لیکن ایک دنیا وہ خود تخلیق کرتا ہے اور وطن کی گلیوں پر نثار بھی ہوتا ہے۔ دُکھ درد کے معنی بھی سیکھتا ہے۔ آپ کی زندگی بھی شاید یہی سفرنامہ ہے کوئے یار سے لے کر سوئے دار تک۔"

"ہاں، یہی سفرنامہ ہے۔" فیض نے پہلا سگریٹ بجھا کے نیا سلگا لیا، اور کہا۔ "سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ گھر میں اُردو فارسی بولی جاتی تھی۔ چھوٹی عمر تھی جب میں نے ایک ذہنی دنیا بنائی اور اشعار لکھنے لگا۔"

"سو اُردو سے آپ کا پہلا عشق تھا مگر کچھ عرصے سے پنجابی میں نظم کہہ رہے ہیں تو پنجابی کو آپ کا دوسرا عشق کہوں؟"

"تھا تو یہ بھی پہلا عشق۔ کانوں میں شروع ہی سے پنجابی گیتوں کی آوازیں رس گھولتی رہی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران لوگ گلیوں میں گایا کرتے اس وقت سے جو بول سینے میں دفن تھے وہ اب میں نے اپنی نظموں میں اتارے ہیں۔"

"اس زمانے کا ایک گیت تھا:

تیرے مکھڑے تے کالا کالا تِل وے، مُراکڈھ کے لے گیا دل وے منڈیا سیالکوٹیا۔"

یہ کہیں آپ کے بارے میں تو نہیں تھا؟ میں نے پوچھا۔

فیض مُسکرائے اور کہنے لگے۔" میں ہوں تو سیالکوٹیا لیکن باپ کی جاگیریں سرگودھا میں تھیں۔ وہاں زمینوں کے مزارع رات کو مل جُل کے گاتے تھے۔ میں نے وہاں صرف ہیر سُنی تھی، یا بُلھے شاہ کی کافیاں یا قصہ سوہنی مہیوال یا مرزا صاحباں۔"

"اس وقت پنجابی لکھنے کو جی نہیں کرتا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"کرتا تو تھا لیکن احساس ہوا کہ ان اُستاد شاعروں کا میں کیسے مقابلہ کر سکتا ہوں، لیکن پنجابی شاعروں کا میں نے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ جتنا کچھ سنا تھا لگتا تھا وارث شاہ کی طرح نہیں لکھ سکتا۔"

"کسی ادیب کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے اس کی شاعری یا اس کے افسانوں کا مطالعہ تو کیا ہی جاتا ہے لیکن ذاتی زندگی کو بھی کئی پہلوؤں سے زیرِ مطالعہ لایا جاتا ہے۔ جیسے ڈی ایچ لارنس کو جاننے کے لیے جب اس کے ناولوں کو دارومدار بنایا گیا تو ہکسلے نے اس کے خطوط کا مجموعہ

چھاپ دیا تھا۔ کیا آپ کے خطوط کا بھی کوئی مجموعہ چھپا ہے؟"

"ہاں چھپ گیا ہے ادھر نہیں آیا ہوگا۔ اس کی ایک کاپی میں تجھے بھجواؤں گا۔"

"آپ کی ایک نظم ہے۔ شاید وہی "اک ذرا سوچنے دو۔" وہ آپ نے آندرے وزنزانسکی کے نام کر دی تھی۔ یہ کس خیال کے تحت اس کے نام کر دی تھی؟"

"اسی طرح کچھ اور نظمیں بھی کچھ اور دوستوں کے نام کر دی ہیں۔ یہ پتہ ہے کہ کس کے بارے میں لکھی ہیں لیکن کسی پر اس کا نام نہیں لکھا۔"

"پھر بغیر نام کے اس کی بات کریں جس کے نام دنیا کے غم رقم کر رہے ہیں"۔

فیض کھل کر ہنس دیے۔ کہنے لگے: "وہ ایک ہوتی تھی (نا) قلوپطرہ، اس سے لے کر تیری ذات تک لوگ ہوتے ہیں جن کے نام دنیا کے غم رقم کیے جاتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ فیض نے میرے سوال اور اپنے جواب کو بہتے دریا میں ڈوبنے کے لیے ڈال دیا تھا۔ پھر جو من پسند نہیں تھا من بھاؤنا ہوگیا۔ ٹیلی ویژن والے اپنی تیز روشنی سمیٹ کر چلے گئے تو میں نے ڈوبتے سورج کی زردی سے معمور آسمان کی سمت کھڑکیاں کھول دیں۔ پچھلی صحن والی کھڑکی کھول دی تو ایک چڑیا کمرے کے اندر آ کر چہکنے لگی۔ میں نے میز سے چائے کی پیالی اٹھالی۔

فیض نے کہا: "لے سن تینوں دساں۔ میں پہلا عشق اٹھارہ وریاں دی عمر وچ کیتا سی۔ "نقشِ فریادی" کی ساری نظمیں میں نے اسی عشق میں لکھی تھیں۔"

"لیکن اسے زندگی میں حاصل کیوں نہ کیا؟"

"ہمت کب ہوتی تھی اس وقت۔ بات کھولنے کی۔ اس کا بیاہ کسی ڈوگرے جاگیردار کے ساتھ ہوگیا۔ پھر دوسرا عشق میں نے اس کے دس برس بعد کیا تھا ایلس سے۔"

"جو اب تمہاری بیوی ہے۔"

"ہاں۔ میں سوچتا ہوں کہ اچھا ہی کیا۔ زندگی کے جس اتار چڑھاؤ سے میں گزرا ہوں، جیلوں میں بھی رہا۔ ایلس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو اس سے ان حالات سے نہ گزرا جاتا۔"

"پھر؟"

"پھر ایک ننھا سا چھوٹی سی لڑکی تھی۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اچانک محسوس ہوا کہ وہ بچی نہیں بڑی حساس

اور نوجوان عورت ہے۔ میں نے پھر عشق کی گہرائی دیکھی۔ پھر اس نے کسی بڑے افسر سے بیاہ کر لیا، درد سے بکھر اگئی تھی۔"

" ایک تمہاری نظم ہے جس میں تم رقیب سے مخاطب "ہو تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رُخسار، وہ ہونٹ کہ زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے "۔ یہ نظم اس کے بارے میں تھی؟"

"نہیں، یہ تو پہلی کے بارے میں تھی جس کی خاطر "نقشِ فریادی" کی نظمیں لکھیں۔"

" پھر ۔؟"

" جیل میں تھا جب کان میں بڑی تکلیف ہو گئی تھی۔ مجھے ہسپتال بھیجا گیا۔ وہاں ایک ڈاکٹر ہوتی تھی جس نے مجھ سے بے پناہ عشق کیا۔ یہاں سے یاد آیا کہ کئی بڑے پولیس افسر بھی تھے جو دن کو مجھ پر مقدمے کی کارروائیاں کرتے تھے اور رات کو اکیلے بیٹھ کر میری نظمیں گاتے تھے۔"

" یہ ہوتی ہے شاعر کی طاقت۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ایلس کو تمہارے ان عشقوں کا علم ہے ؟"

" ہاں۔ اصل میں وہ میری بیوی نہیں میری دوست ہے اس لیے زندگی چل سکی۔ عشق میں بہت درد ہوتا ہے جبکہ دوستی میں ایک سکون ہوتا ہے۔"

فیض نے ہاتھ کا جلتا ہوا سگریٹ بجھا دیا اور سنجیدہ ہو کر کہا۔

" اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب مزید عشق نہیں کروں گا، البتہ دوستی کروں گا، جب بھی کوئی دوستی کے قابل ہوا۔"

٭٭٭٭٭
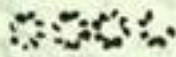
فیض احمد فیض ــ ایک انٹرویو
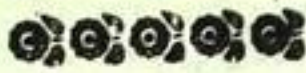
اقتباسات ــــــــــــــ طاہر مسعود

فیض احمد فیض، عہد حاضر میں اُردو شاعری کا سب سے بڑا نام تھا، ان کے کلام کی حسن و ...
شیرینی اور نغمگی کے دوست دشمن پہلے بھی معترف تھے، اب بھی ہیں۔ ان کی شاعری نے اردو زبان کو
ایک نیا اسلوب اور سیاسی پس منظر عطا کیا، ان کی غزلیں اور نظمیں ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں ہم
اپنے عہد کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اقبال کے بعد اُن جیسی عزت اور مقبولیت کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو نصیب
نہیں ہوئی، کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ فیض کو لوگوں نے پڑھا کم ہے اور ان سے محبت زیادہ کی ہے

۔ ۔ ۔ فیض احمد فیض شاعر تو بڑے تھے ہی، انسان بھی بڑے تھے۔ انتہائی ... وضعدار،
خوش خلق، انسان دوست، کم سخن محبت آمیز، اپنے انسانی اوصاف کی بنا پر وہ دوستوں کے
علاوہ نظریاتی مخالفین میں بھی پسند کیے جاتے تھے۔ انہوں نے مدرسی کی، صحافی رہے، نظم و نثر میں
کمال حاصل کیا،

جیل کاٹی، لینن امن انعام ملا۔ دُور دراز کے سفر کیے، ملک کی شناخت بنے۔ ان کی شخصیت کو روس کی
طرف ان کے غیر معمولی جھکاؤ نے متنازعہ بنایا۔ انھوں نے کبھی روس کے سامراجی کردار پر نکتہ چینی
نہیں کی، تاہم کہتے ہیں کہ وہ پاک روس تعلقات میں سفارت کی خاموش کھڑکی تھے۔ یہ کھڑکی ۲۰ نومبر
۱۹۸۴ء کی ایک دوپہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

فیض احمد فیض کی شاعری ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔ ہندوستان میں سیاسی تحریکات
عروج پر تھیں۔ ملک سیاسی اور اقتصادی بحران سے گزر رہا تھا فیض شرمیلے اور الگ تھلگ رہنے
والے نوجوان تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری کا مزاج سراسر رومانی ہونے کے باوجود ان کا اسلوب
دوسروں سے منفرد و مختلف تھا۔ ترقی پسند تحریک میں شمولیت سے اُن کی شاعری کو ایک نیا رخ

ملا۔ پہلے ان کا غم ذاتی تھا۔ پھر اجتماعی ہو گیا۔ پہلے وہ صرف تماشائی تھے، بعد میں اس تماشے کا حصہ بن گئے جو برِ صغیر کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد پنڈی سازش کیس کی بنا پر اسیرِ زنداں ہوئے تو تجربات میں مزید تنوع پیدا ہوا اور ان کی شاعری زنجیر کی چھنک اور سلاسل کی چمک سے آشنا ہوئی۔ قید و بند کی صعوبتوں نے ان کی شخصیت کو اور نکھارا اور انھیں سیاسی سطح پر وہ اہمیت دلائی جو کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔

تصانیف : (۱) نقشِ فریادی (۱۹۴۱ء) (۲) دستِ صبا (۱۹۵۳ء) (۳) زنداں نامہ (۱۹۵۶ء) (۴) دستِ تہِ سنگ (۱۹۶۵ء) (۵) میزان (تنقیدی مضامین) (۱۹۶۲ء) (۶) سرِ وادیٔ سینا (۱۹۷۱ء) (۷) صلیبیں مرے دریچے میں (خطوط) (۱۹۷۱ء) (۸) متاعِ لوح و قلم (نثر) ۱۹۷۳ء (۹) ہماری قومی ثقافت (نثر) (۱۹۷۶ء) (۱۰) شامِ شہرِ یاراں (۱۹۷۸ء) (۱۱) مہ و سالِ آشنائی (یادداشتیں) (۱۲) مرے دل مرے مسافر (۱۹۸۱ء) (۱۳) سارے سخن ہمارے (۱۹۸۳ء) (۱۴) نسخہ ہائے وفا (۱۹۸۴ء)

سوال: پچھلے دنوں کہیں آپ نے کہا تھا کہ آپ شاعری میں کمال حاصل نہیں کر سکے۔ اس سے آپ کی کیا مراد تھی۔

فیض: یہ اور بات ہے لوگ ہمیں چاہتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ جو ہماری تمنا تھی وہ پوری نہ ہو سکی لیکن ان تمناؤں کی تکمیل کے بغیر بھی اتنا صلہ مل چکا ہے کہ شکایت کرنا ناشکر گزاری ہوگی۔ ہماری تمنا تھی کہ ہم شاعری میں درجۂ کمال کو پہنچے، مثلاً ناظم حکمت، پابلو نرودا، لورکا وغیرہ ہمارے عہد کے شاعر ہیں، ظاہر ہے ہم ان جتنے بڑے شاعر تو نہیں ہیں، ہماری مثال تو عربی کے اس محاورے کے مطابق ہے کہ ہم بڑے نہیں تھے، بڑوں کے مر جانے نے ہمیں بڑا بنا دیا ہے۔

سوال: آپ کے ناقدین کے خیال میں آپ کو بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اہمیت دی جاتی ہے۔ ابتدائی زمانے میں تو آپ کو پنڈی سازش کیس کے حوالے سے شہرت ملی اور اب بائیں بازو کے عناصر نظریاتی ہم آہنگی کی بنا پر آپ کو اور آپ کے نام کو بطور علامت (Symbol)

کے استعمال کرتے ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: بات یہ ہے کہ راولپنڈی سازش کیس، جیل خانہ، سیاست یا اس طرح کے جو واقعات یا قصے ہمارے ساتھ پیش آئے، فرض کیجیے یہ سب پیش نہ آتا تو فی الحال یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ آگے چل کر کیا ہوتا اور کیا نہیں ہوتا۔ رہا سوال مخالفین کا تو مخالفین کی بات دوسری ہے۔ اس لیے کہ انھیں ہماری ذات سے مخالفت یا مخاصمت تو ہے نہیں۔ ان کی مخالفت تو ہمارے سیاسی نظریات سے ہے۔ اگر ہم جیل خانے نہ بھی گئے ہوتے اور کچھ نہ بھی کیا ہوتا تو بھی انھیں ہماری مخالفت کا کوئی نہ کوئی بہانہ تو مل ہی جاتا، اس پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم جیل نہیں جاتے تو ہمارے پاس اخبارات رہتے۔ اگر مارشل لا قائم نہ ہوتا تو اخبار ہم سے چھینا نہ جاتا اور ہم صحافت ہی کرتے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی نام پیدا کرنے کی گنجائشیں موجود تھیں، امکانات روشن تھے، ہاں ممکن ہے شاعری میں پیچھے رہ جاتے اور صحافت کے ذریعے لوگوں کی خدمت کر لیتے۔ یا یہ بھی ممکن تھا کہ ہم صحافت میں نہ ہوتے اور مدرسی ہی کرتے رہتے جس سے ہم نے اپنی زندگی شروع کی تھی۔ ممکن ہے اس پیشے سے وابستگی کے نتیجے میں ہماری استعداد میں اضافہ ہو جاتا اور ہم کم از کم اچھے استاد ہو جاتے۔

ہوا یوں کہ راستے میں اِدھر اُدھر کے بہت سے موڑ آئے اور سب کچھ خود بخود ہوتا رہا۔ ہم نے اپنی مرضی سے کوئی بھی پیشہ اختیار نہیں کیا۔ حالات بدلتے گئے اور ہمیں ان حالات کے ساتھ ساتھ چلنا پڑا۔ اب یہی دیکھیے کہ اخبارات ضبط ہوئے لیکن ہم نے انھیں اپنے شوق سے تو ضبط نہیں کرایا۔ اگر یہ سب کچھ اس طرح سے رونما نہ ہوا ہوتا تو ممکن ہے ہمیں شاعری کرنے کا زیادہ وقت مل جاتا اور ہم اس پر زیادہ توجہ اور وقت دے سکتے یا مدرسی ہی کر لیتے یا کچھ اور۔ جن حضرات کا یہ کہنا ہے کہ ہمارا نام اس لیے ہو گیا کہ ہم جیل خانے چلے گئے تھے تو سوال یہ ہے کہ جو لوگ جیل خانے نہیں گئے انھیں شہرت کیسے مل گئی۔ مثلاً فراق صاحب تو جیل نہیں گئے تھے، اس سے ان کی شاعری میں فرق تو نہیں آیا۔

سوال: راولپنڈی سازش کیس تو خیر اب پرانی بات ہو گئی، لیکن میں جس نسل کا نمائندہ ہوں، کم ازکم اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہے کہ آپ کی شخصیت اور شاعری جتنی دلآویز ہے، اس کے پیشِ نظر یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ بھلا آپ کا کسی سازش، بغاوت یا حکومت کا تختہ اُلٹنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

اب جبکہ اس واقعے کو بھی برسوں بیت چکے ہیں آپ اس بارے میں کچھ ارشاد فرمانا پسند کریں گے؟

فیض: بھئی قصہ یہ ہے کہ سارا پنڈی سازش کیس جو ہے وہ جسے بات کا بتنگڑ بنانا کہتے ہیں، وہ ہے چونکہ ہم فوج میں رہ چکے تھے اس لیے بہت سے فوجی افسر ہمارے دوست تھے۔ ان سے ہمارے ذاتی مراسم تھے، ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہمارے سیاسی نظریات ہم آہنگ تھے۔ قصہ صرف اتنا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک میں کیا ہونا چاہیے؟ کس طریقے سے یہاں کے حالات بہتر بنائے جائیں، چونکہ ملک کو بنے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور نہ یہاں آئین بنا تھا، نہ سیاست کا ڈھانچہ ٹھیک طریقے سے منظم ہوا تھا۔ ملک کے برّی، بحری اور ہوائی افواج کے سربراہ لیاقت علی خاں تھے۔ کشمیر کا قصہ بھی تھا۔ غرض یہ کہ اس طرح کے مسائل تھے۔ جن پر عموماً گفتگو رہتی تھی۔ چونکہ ان دوستوں سے میرے ذاتی مراسم تھے، اس لیے ہم بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے خود ہی ساری منصوبہ بندی کی اور ہم سے کہا، ہماری بات سنیے۔ ہم نے ان کی بات سن لی، پھر انھوں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ حکومت کا تختہ نہیں اُلٹنا ہے۔ انگریزوں نے سازش کا ایک قانون وضع کیا ہوا ہے کہ اگر تین آدمی ایک جگہ موجود ہوں، اور ان میں سے دو آدمی کسی بات پر زبانی متفق ہو جائیں اور تیسرا آدمی گواہی دے کہ یہ دونوں اس بات پر متفق ہو گئے تھے تو سازش ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ضرورت نہیں رہتی کہ کسی قسم کی عملی کارروائی کی جائے۔ ہمارے معاملے میں اس قانون کے بجائے نیا قانون بنایا گیا تاکہ فوری طور پر صفائی کی جو گنجائشیں رکھی گئی ہیں اُن کو حذف کیا جا سکے۔ یہ قانون بھی پارلیمنٹ یا نیشنل اسمبلی کے ذریعے منظور نہیں ہوا بلکہ اسے قانون ساز اسمبلی نے وضع کیا تھا۔

اور قانون ساز اسمبلی کا فیصلہ کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ ہم نے بتایا، ہماری میٹنگ میں یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہمیں حکومت کا تختہ نہیں الٹنا ہے، اور کسی نے اوپر جا کر مخبری کر دی کہ ہم لوگوں نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا منصوبہ بنایا تھا، لیکن پھر فیصلہ کیا ہے کہ منصوبے پر عملدر آمد نہ کیا جائے۔ لیکن ہم پر مقدمہ اس کے برعکس بنایا گیا۔ دوسری طرف استغاثہ کے جو جو انچارج تھے انھوں نے ہمیں بتایا کہ آپ لوگوں کی ساری باتیں ٹھیک ہیں یعنی یہ کہ آپ لوگ ملے تھے۔ آپ نے گفتگو کی تھی، آپ نے طے کیا تھا کہ حکومت کا تختہ نہیں اُلٹنا ہے، ہم نے صرف اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا تھا کہ آپ نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مزید یہ کہ جن لوگوں نے یہ سارا پلان بنایا تھا۔

سوال: میجر جنرل اکبر خان نے؟

فیض: جی ہاں انھوں نے ساری بات کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ کچھ نہیں کرنا ہے جو کاغذات اس سلسلے میں تیار کیے تھے وہ تلف نہیں کیے تھے، وہ ان کے پاس موجود تھے اور جب کسی نے مخبری کی تو سارے کاغذات نکل آئے۔ اور پھر بات کا بتنگڑ بنایا گیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ حکومت ہمارے دوست فوجی افسروں سے خفا تھی۔ دوسرے حکومت کا شاید یہ تاثر بھی تھا کہ شاید یہ لوگ پوری طرح سے فرماں بردار نہیں ہیں، وہ ان سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے، اس طرح انھیں ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ ہم تو بیچ میں یونہی آ گئے۔

سوال: اس واقعے نے تو آپ کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہوں گے؟

فیض: ہم چار سال تک جیل میں رہے۔ بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ پڑھنے لکھنے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقعہ ملا، ہمارا ضمیر مطمئن تھا کیوں کہ ہم نے کچھ کیا ہی نہیں تھا، ہم بے گناہ تھے۔

سوال: ایسی سزا جو بے گناہ اور بے قصور ہونے کے باوجود ملے، کیا شدید غم و غصہ اور جھنجھلاہٹ کو جنم نہیں دیتی؟

فیض: غصہ تو آتا ہے، لیکن اس سے مورال بلند رہتا ہے، ہمت بلند رہتی ہے۔

سوال: کوئی ایسا مرحلہ درمیان میں آیا جب معافی نامہ وغیرہ لکھ کر رہائی پا لینے کی پیش کش ہوئی ہو؟

فیض: سازش کیس میں معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے ایسا کوئی موقع نہیں آیا، ہاں البتہ ایوب خاں کے دور میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے تھے، اس میں پیش کش ہوئی کہ معافی مانگ لو اور رہا ہو جاؤ۔ لیکن ظاہر ہے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال: آپ کے سیاسی نظریات کی وجہ سے ملک میں ایک طبقہ آپ کا شدید مخالف رہا ہے۔ اس نے آپ کی سیاسی اور نظریاتی وابستگی کی بنیاد پر آپ کو ہمیشہ اپنی تنقید اور طعنہ زنی کا نشانہ بنایا، لیکن آپ میں ایک خوبی جسے میں نے ہمیشہ مستقل مزاجی کے ساتھ آپ کے اندر موجود پایا، اور وہ یہ کہ آپ نے ان عناصر کو پلٹ کر جواب کبھی نہیں دیا اور نہ ہی ان کی سطح پر اُترے۔ یہ خوبی اتفاق سے میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اندر بھی پائی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی اس نوع کی مخالفتوں کے پیشِ نظر دل گرفتہ، مایوس یا تلخ ہوئے۔

فیض: ہم اپنی ذات کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور نہ اسے مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کے لیے کسی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیں۔ کوئی اصول یا نظریے کی بات ہو تو اس پر بحث کی جا سکتی ہے کیونکہ بحث کرنے کا جواز موجود ہے، لیکن اگر کوئی ذاتی اعتراض ہو اور آپ اس کا اسی شدت سے جواب دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ معترضین کی سطح پر اتر گئے ہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ کی ذات پر اعتراضات آپ کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کے عقائد و نظریات کی وجہ سے کیے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کو اتنی اہمیت کیوں دے؟ اپنی شخصیت کے حوالے سے بات کرنا محض تضیعِ اوقات ہے۔

. . . .

سوال: ایک نقاد نے آپ کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ جانے آپ کی شاعری میں ایسا کیا جادو ہے کہ اسے پڑھ کر ایک طرف سرمایہ داروں کی کوٹھیوں پر ہل چلانے کے خواب دیکھنے والے انقلابی بھی جھومتے ہیں اور دوسری طرف انہی کوٹھیوں کے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر انقلابیوں کو غدار کہنے والے سرمایہ دار بھی آپ کی شاعری سے اسی قدر

لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے آپ اپنی شاعری کی اس خوبی کی کیا تعبیر پیش کریں گے؟

فیض: میری شاعری کے اس پہلو کی کوئی ترقی پسندانہ توجیہ ہو سکتی ہے تو وہ غالباً یہی ہے کہ زندگی کی بعض حقیقتیں ایسی ہیں جن کا اطلاق سبھی پر ہوتا ہے۔ ترقی پسند کے علاوہ اگر کوئی سرمایہ دار بھی میرے شعر پڑھ کر جھومتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر بھی ضمیر موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شعر کا ایک فنی پہلو بھی ہوتا ہے جس کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ غالب، میر یا شیکسپیئر کی شاعری کا بھی ایک جمالیاتی پہلو ہے، جو ماورائے طبقہ ہے، یعنی غیر طبقاتی ہے۔ شعر پڑھنے والا شاعری میں سے اپنی پسند کا عنصر الگ کر لیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے جیسے ملک میں لازم ہے کہ آپ کی بات صرف ایک طبقے تک نہ پہنچے بلکہ ہر طبقے تک ہماری آواز پہنچے، کیونکہ معاشرے میں ہر طبقے کا کوئی نہ کوئی کردار ہوتا ہے۔ سماجی کاروبار میں، معاشرے کی ترتیب و تنظیم میں ان کا اپنا رول ہوتا ہے۔ لہٰذا کوشش کرنی چاہیے کہ آپ کا پیغام کسی ایک طبقے تک محدود نہ رہے، تاکہ وہ لوگ جن کا تعلق مظلوم و محکوم طبقے سے نہیں ہے۔ ان کے ذہن یا ضمیر پر بھی یہ حقیقت واضح ہو کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں انھیں ترمیم کرنی چاہیے۔ ان کے اندر تبدیلی واقع ہو گی تو لازماً اس کا اثر عوام پر بھی مرتب ہو گا۔

سوال: مجنوں گورکھپوری صاحب نے ایک انٹرویو میں رائے ظاہر کی تھی کہ ترقی پسند تحریک اس لیے ختم ہو گئی کہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا تھا۔ آپ ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟

فیض: مگر ترقی پسند تحریک ختم کہاں ہوئی ہے؟

سوال: ظاہر ہے ۳۶ء والی صورتِ حال تو نہیں رہی ہو گی۔ ادب میں نئی تحریکات اور نئے رجحانات در آئے ہیں۔

فیض: ترقی پسندی کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تنظیم ختم ہو گئی ہے۔ تنظیمیں تو ختم ہوتی اور بنتی رہتی ہیں لیکن تحریکیں ختم نہیں ہوتیں۔ ترقی پسندی ہم نے تو پیدا نہیں کی تھی، وہ تو شروع سے چلی آ رہی ہے۔ حالات کے تقاضے نے ایک تنظیم کو جنم دیا اور پھر حالات ہی کی بنا پر تنظیم ختم بھی ہو گئی لیکن تحریک ختم کہاں ہوتی ہے۔

ترقی پسند تحریک اس زمانے میں جاری ہوئی تھی جب ترقی پسند تحریکیں چل رہی تھیں اور ادب میں داخلیت پسندی ذاتی اور غیر شعوری تجربات کا اظہار کرنے والے موجود تھے اس وقت بھی دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اور بعد میں جو نئی تحریکیں پیدا ہوئیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ادب میں تحریکیں پیدا ہوتی رہتی ہیں جہاں تک ترقی پسندی کا تعلق ہے یعنی اس نقطۂ نظر کا کہ عوام کے مصائب و آلام کو ادب میں منعکس ہونا چاہیے تو اس میں کوئی بُعد نہیں ہاں یہ ٹھیک ہے کوئی تنظیم نہیں بن سکی۔

. . . . . .

سوال: جس دور کا ذکر ہو رہا ہے، اس وقت تک معاشرہ پر ادیبوں اور دانشوروں کے اثرات گہرے تھے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادیبوں پر بحیثیتِ مجموعی قومی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فرانس میں الجزائر کی جنگ آزادی کے معاملے میں سارتر نے جس بے باکی سے ایک موقف اختیار کیا یا جیسا کہ آپ نے لورکا اور نرودا وغیرہ کے نام لیے۔ انھوں نے شاعر ہونے کے باوجود جو سیاسی کردار ادا کیا۔ اس درجے کا کردار ہمارے ادیبوں میں نظر نہیں آتا، آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: کیوں نہیں نظر آتا۔ جس حد تک ہمارے ادیبوں میں صلاحیتیں تھیں اس کے مطابق انھوں نے اپنا کردار ادا کیا اور پھر سارتر اور لورکا جتنے بڑے ادیب ہیں، تو ہمارے ہاں نہیں تھے، اور بڑے ادیب روز پیدا نہیں ہوتے۔ بڑے ادیب پیدا کرنے کا کوئی نسخہ تو ہے نہیں۔ فرانس میں بھی آپ سارتر یا اراگون کا نام لے دیں گے، اس سے زیادہ نام تو وہاں بھی نہیں ہیں اور بعض ملکوں میں تو ایک نام بھی نہیں ملے گا۔ یہ تو محض اتفاق ہے۔

سوال: مثلاً یہ دیکھیے کہ ہمارے ملک کا ایک حصہ علیحدہ ہو گیا، ایک بازو کٹ گیا۔ لیکن ادبی سطح پر جمود طاری رہا۔ اتنے عظیم سانحے نے ہمارے ادیبوں کے باطن میں کوئی ہلچل، کوئی طوفان برپا نہیں کیا، کوئی بڑا ناول، کوئی ایسا ادب تخلیق نہیں ہوا جس کی بنیاد پر یہ ہم کہہ سکیں کہ اقتدار پرستوں کے ضمیر مر چکے ہیں، لیکن ہمارے ادیب زندہ ہیں۔

فیض: ایسا اس لیے نہیں ہوا کہ جو بازو کٹا ہے، ادب وہاں پیدا ہونا چاہیے، کیونکہ بازو ہمارا نہیں

ان کا کٹنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی پاکستان کے لوگوں کے لیے یہ بات کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تجربہ تو مشرقی پاکستان یا بنگالیوں کے لیے تھا۔ لہٰذا انھیں بڑا ادب تخلیق کرنا چاہیے۔

سوال: کیا شاعری کی کوئی ایسی قسم ممکن نہیں جسے خود کلامی سے تعبیر کیا جائے۔؟

فیض: بالکل ممکن ہے خالص جمالیاتی شاعری کا تصور بھی موجود ہے اور اس میں فرحت کا پہلو بھی ہے جو شاعری کے لیے لازم ہے لیکن اس کا میدان بہت محدود ہے۔ داغ کی شاعری بہت اچھی ہے لیکن آپ اسے غالب کے مقابلے پر تو نہیں رکھ سکتے۔ شاعری میں مضمون کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ محض فنی کمال سے بڑی شاعری پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی محض پروپیگنڈے سے دونوں چیزیں یکجا ہوں، تب جاکر بڑی شاعری جنم لیتی ہے۔ خالص رومانی یا خالص غنائیہ شاعری کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی اپنی جمالیاتی افادیت ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ راشد نے اظہار کے نئے نئے سانچے بنائے اور اسلوب میں بھی تجربات کیے۔؟

فیض: تجربات تو ضرور کیے مگر محض تجربہ کرنا کافی نہیں ہے۔ تجربے کی اہمیت تو اسی وقت ہوتی ہے جب تجربہ کامیاب ہو۔ ایک شاعر کا تجربہ جو اس کی حد تک محدود رہا اور شاعر کا حال یہ ہے کہ اسے آگے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، تجربے کا کمال یہ ہے کہ اس سے بڑا آرٹ پیدا ہو۔

سوال: ایلیٹ نے لکھا ہے کہ ندرت تکرار سے بہتر ہے۔!

فیض: تکرار سے تو ہر چیز بہتر ہے۔ آپ اقبال کی مثال لیں، اُن سے زیادہ تکرار کس کے یہاں ملتی ہے مگر اس سے اُن کی شاعری میں فرق تو نہیں آیا۔ تکرار کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ مکھی پر مکھی مارتے چلے جائیں گے اور دوسری یہ کہ آپ ایک پرانے مضمون کو اس طرح آگے بڑھائیں کہ اس میں حسن پیدا ہو جائے اور تکرار باقی نہ رہے۔

فیض سے ایک گفتگو

اقتباسات
نصرت چوہدری

نصرت: اردو ادب میں آپ کا ایک منفرد مقام ہے، اور اس کے علاوہ عالمی ادب پر بھی آپ کی نظر ہے اور اب یہ کم و بیش تسلیم بھی کر لیا گیا ہے کہ روایت اچھے ادب کی اساس ہے، مگر ایک سوال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ کیا مشرق کی ادبی روایت مغرب کی روایت کا مقابلہ کر سکتی ہے؟

فیض: مقابلہ تو یقیناً کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ ہر ملک کی روایت جو ہے وہ اس ملک کے مزاج کے مطابق حالات کے مطابق، اس ملک کے کلچر کے مطابق اس کا Expression ہوتا ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس ملک کی روایت بڑھیا ہے اور اُس ملک کی روایت گھٹیا ہے۔ ان میں بہتری یا کم تری کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کیا چیزیں مشترک ہیں اور کیا مختلف۔ اس بنیاد پر ان میں تقابل ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارا تو زیادہ تعلق یا زیادہ مطالعہ انگریزی شاعری کا ہے۔ ہماری شاعری اور ان کی شاعری کا فرق ہماری تاریخ اور ان کی تاریخ کا فرق ہے۔ ہمارے کلچر اور ان کے کلچر کا فرق ہے۔ ہمارے یہاں صدیوں تک ایک ہی نظام قائم رہا جس کو ہم نوابی، شاہی یا جاگیردارانہ نظام کہتے ہیں اور اس وجہ سے ہمارے طرز زندگی میں بہت زیادہ داخلی تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ مغلوں کے آنے سے پہلے یا یوں کہیے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے بادشاہتیں بنتی بگڑتی رہیں۔ لوگ آتے رہے اور اپنی اپنی تہذیب اپنے اپنے ساتھ لاتے رہے۔ ہر کسی کے آنے کے بعد زبان بدلی۔ شاعری کے علاوہ مختلف علوم پر اثر پڑا، لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا جب تک انگریز نہیں آئے۔ اس دوران میں ایک بڑا فرق یہ آیا یعنی سترھویں اٹھارھویں صدی کے بعد یا دوسرے الفاظ میں انگریزوں کے آنے کے بعد انحطاط شروع ہوا۔ ہماری تہذیب کا بھی اور ہمارے کلچر کا بھی۔ اُردو شاعری اس عہد میں اپنے عروج کو پہنچی۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ جب کسی تہذیب کا عروج ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف ادب بلکہ تمام فنون کا بھی عروج ہوتا ہے۔

اردو شاعری کی ایک نسبتاً مختلف حیثیت ہے کہ اس کا عروج اُس وقت ہوا جب ملک کی تہذیب کا، ملک کے کلچر کا، ملک کی ثقافت کا اور ملک کی سیاست کا انحطاط ہو رہا تھا، زوال ہو رہا تھا۔

. . . . . .

نصرت: جسے ہم اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کہتے ہیں وہ آپ کے خیال میں کس شاعر سے شروع ہوتی ہے؟

فیض: جہاں تک اردو شاعری کی روایت کا تعلق ہے روایت شروع ہوئی ولی دکنی سے۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی اردو شاعری موجود تھی، مگر جس کو ہم اُردو کی کلاسیکی روایت کہتے ہیں وہ ان سے شروع ہوئی۔ ان کے بعد پہلے بڑے شاعر میر پیدا ہوئے۔ میر کی جو روایت تھی اس میں درد و غم اور دنیا سے بیزاری کا عالم تھا۔ ان کے مقابلے میں سودا پیدا ہوئے جو کہ نسبتاً زیادہ حقیقت پسند، زیادہ Realistic زیادہ جان دار شاعر تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ روایتیں ہیں، زبان کے اعتبار سے بھی۔ اس لیے کہ میر کی زبان سادہ، شیریں، میٹھی اور ہندی نما تھی۔ اس کے برعکس سودا کی زبان زیادہ پُرشکوہ، زیادہ زوردار اور فارسی نما تھی۔ خیالات اور مضامین کے اعتبار سے بھی دونوں مختلف تھے۔ سودا جو تھے وہ زیادہ Realistic یعنی خارجیت پسند تھے۔ جو لوگوں پر گزر رہی تھی اس کی زیادہ عکاسی کرتے تھے۔ میر زیادہ داخلیت پسند تھے۔ یہ دونوں روایتیں ساتھ ساتھ چلیں، اس کے بعد جب یہ دَور ختم ہوتا ہے عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی دَور کے خاتمے پر یا اس کے آغاز میں بڑا شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اس عہد کے خاتمے پر پیدا ہوئے غالب۔ انھوں نے سارے دور کا خلاصہ کر دیا، اس روایت کا جو تقریباً دو سو سال سے چل رہی تھی ایک طرح سے غالب میں اس کا خلاصہ ملتا ہے۔ غالب کی شعری روایت کے تین پہلو ہیں۔ ایک تو ماضی کے بارے میں۔ ماضی کتنا اچھا ہے۔ اس کا حسن، اس کی خوب صورتی وہ تہذیب جس سے وہ واقف تھا اور وہ ان کی آنکھوں کے سامنے مٹ رہی تھی۔ ایک طریقے سے اس کا مرثیہ غالب نے لکھا۔ ان کی شاعری کا دوسرا پہلو ہے حال۔ اس میں تباہی بے سرو سامانی اور اداسی کا مضمون ہے۔ تیسرا پہلو ہے مستقبل۔ اس میں امید بھی ہے اور خوف بھی۔

ایک کیفیت ہے کہ پتا نہیں اب کیا ہونے والا ہے۔

. . . . . .

نصرت: اس دَور کا سب سے بڑا شاعر آپ کے خیال میں کون ہے اور نئی شاعری کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے؟

فیض: اس دَور کے سب سے بڑے شاعر یقیناً اقبال ہیں جو اس دَور کے اخیر میں آتے ہیں۔ دیکھیں نا ہر دَور میں شاعر جو ہے وہ نہ صرف حالات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ کسی حد تک ایک طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ طبقہ جو سب سے زیادہ Influential ہوتا ہے، سب سے زیادہ با اثر ہوتا ہے۔ اس طبقے کے خیالات اس کے مضامین، اس کی ذہنیت شاعری میں داخل ہوتی ہے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے یہ طبقہ اُمرا، رؤسا اور نوابوں کا طبقہ تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی مڈل کلاس آگئی۔ اگلی شاعری جو ہے اقبال تک اس متوسط طبقے کی شاعری ہے۔ ان میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا ہوا قومیت کا جذبہ، آزادی کا جذبہ اور اس زمانے میں جو انگریزی شاعری کی تقلید ہوئی ہے وہ سطحی اس لیے بھی تھی کہ ان میں سے بیشتر انگریزی سے تقریباً ناواقف تھے لیکن بعد میں لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی، مغرب سے پڑھ لکھ کر آئے، انھوں نے غور و فکر اور مطالعے کے بعد انگریزی کو اور انگریزوں کے شاعرانہ Methods کو اپنا لیا اور پھر یہ نئی شاعری پیدا ہوئی۔

. . . .

نصرت: آپ کے خیال میں شاعری میں نئے تجربے ہونے چاہییں یا اپنی صحت مند کلاسکی روایت کی توسیع کرتے رہنا چاہیے؟

فیض: کوئی بھی تجربہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں روایت کا جوہر اس کی رُوح نہ ہو، یعنی تجربے کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے ایک ننھا سا بیج ایک ننداآور درخت بنے اور اس کے لیے مناسب زمین اور موزوں موسم کے علاوہ اس کی جڑ کے پھیلنے اور پھولنے کی گنجائش ہو، مناسب مقدار میں پانی دستیاب ہو، کوئی تجربہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں جان نہ ہو، اور جہاں تک روایت کا تعلق ہے، وہ اس وقت تک نہیں چلتی، جب تک وہ بدلتے موسموں کا خیال نہ رکھے۔ نئے تقاضے، نئے تجربوں کی بنیاد بنتے ہیں، اگر یہ تقاضے

پورے نہ ہوں تو پیڑ پھلتا پھولتا کہاں ہے مرجھا جاتا ہے۔

نصرت : ایک ذاتی سوال۔ آپ نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کن شاعروں کا اثر قبول کیا؟

فیض : جب شاعری شروع کی تو اس وقت کے جو بھی مشہور شاعر تھے ان کا اثر آیا۔ مثلاً اختر شیرانی، حسرت موہانی۔

نصرت : جوش ملیح آبادی؟

فیض : جوش کا اتنا اثر ہم پر نہیں تھا۔

نصرت : علامہ اقبال کا؟

فیض : یوں تو اس عہد میں پورے ادب پر اقبال کا اثر تھا مگر جہاں تک براہِ راست میرا تعلق ہے وہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں عام طور سے ہر شاعر رومانی شاعری کرتا ہے، اس لیے اس زمانے کے جو رومانی شاعر تھے، اختر شیرانی، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری، ان کا اثر مقابلتاً زیادہ تھا اور ظاہر ہے کہ انگریزی کے ساتھ بھی لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں انگریزی کے بھی مشہور شاعر کیٹس اور شیلے تھے، انہی کا رواج تھا، ان کا بھی اثر تھا۔ پھر ہمارے کالج میں ہمارے سینیر راشد تھے اور راشد اس وقت شاید اختر شیرانی کے شاگرد تھے یا ان سے قریب تھے، ان کی دوستی کی وجہ سے ان کا بھی اثر تھا۔ گھر کے ماحول کے پیشِ نظر فارسی شاعری کا اثر بھی تھا۔ اسکول اور کالج میں عربی پڑھی اس لیے عربی شعراء سے بھی تھوڑی سی واقفیت تھی۔

نصرت : اور پنجابی، آپ نے پنجابی شاعری بھی تو کی ہے؟

فیض : یہ تو ابھی کی بات ہے، کسی نے چیلنج کر دیا تھا کہ پنجابی میں شاعری کر کے دکھائیں۔ ہم نے کہا کہ اچھا دکھا دیتے ہیں پنجابی بھی لکھ کے۔

نصرت : پنجابی کے حوالے سے آپ نے پنجابی زبان کو کیسا پایا؟

فیض : پنجابی کی خاص بات یہ ہے کہ بہت سے مضامین ایسے ہیں کہ جو صرف پنجابی میں لکھے جا سکتے ہیں آپ انھیں اردو میں نہیں لکھ سکتے۔

نصرت : آپ کا اشارہ عوامی شاعری کی طرف ہے۔

فیض : جی ہاں، عوامی شاعری اُردو میں ہو ہی نہیں سکتی۔

نصرت : آپ کے اس بیان پر کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ آپ نے ایسا کہہ کر اُردو کو صدمہ پہنچایا ہے؟

فیض : میرا خیال ہے کہ اس میں صدمے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی بُرا پہلو نہیں ہے اس میں۔ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اردو جو ہے وہ شہری زبان ہے، وہ گاؤں میں بولی ہی نہیں جاتی۔ کسی بھی علاقے کے دیہات میں اُردو نہیں بولی جاتی۔ آپ دلی سے چند میل باہر چلے جائیں، وہاں لوگ اُردو نہیں بولتے۔ لکھنؤ سے تین چار میل باہر چلے جائیں وہاں بھی اُردو نہیں بولی جاتی۔ وہاں کی زبان اگر ہے تو کہیں کھڑی بولی تو کہیں برج۔ آپ انھیں عوامی بولی کہہ سکتے ہیں مگر اُردو نہیں۔

نصرت : آپ کا مطلب ہے کہ وہ اُردو کی اُدبی زبان نہیں ہے؟

فیض : جی ہاں۔ اس پس منظر میں میں کہتا ہوں کہ اُردو خالص شہری زبان ہے، وہ دیہات میں کہیں بھی نہیں بولی جاتی۔

نصرت : آپ نے کسی جگہ لکھا ہے کہ اگر آپ کوشش کریں تو غالب جیسا شعر کہہ سکتے ہیں مگر بلّے شاہ یا وارث شاہ جیسا نہیں۔

فیض : بالکل نہیں کہہ سکتا، مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بڑے شاعر ہیں۔ بڑا شاعر غالب بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پنجابی محاوروں پر ہمیں اتنا عبور نہیں ہے جتنا اُردو محاوروں پر۔ اُردو روایتی شاعری پر جتنا عبور ہے اتنا اس روایت پر نہیں جو پنجابی شاعری کی کلاسیکی روایت ہے۔ ہمارے ذہن اور دماغ کی ساخت اب کچھ ایسی ہو چکی ہے جو صرف اردو شاعری کے لیے موزوں ہے۔

. . . . . .

نصرت : آپ کی بیشتر شاعری نظریاتی شاعری ہے۔ کیا آپ کے خیال میں "نظریہ" سامنے رکھ کر اچھا شعر کہا جا سکتا ہے؟

فیض : میرا ایک نظریہ ہے، مگر نظریے کو سامنے رکھ کر انسان شاعری نہیں کرتا۔ وہ نظریہ شاعری کا جزو بن جاتا ہے، بلکہ آدمی کی اپنی ذات کا جزو بن جاتا ہے، اسے سامنے "

لکھنے کا سوال نہیں اُٹھتا۔ شاعری ایک مضمون سامنے رکھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ وہ مضمون جب اس کی وارداتِ قلب، اس کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے تبھی وہ شعر کے رُوپ میں ڈھلتا ہے۔

نصرت: اس سے یہ سمجھا جائے کہ کوئی ایسا شاعر نہیں ہے جو محض ایک مخصوص نظریہ کو سامنے رکھ کر شعر کہتا ہے؟

فیض: کیوں نہیں ہیں، ایسے بھی شاعر ہیں جو کہ نظریہ کو شعر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

.....

نصرت: جب کوئی مضمون آپ کے ذہن میں اُبھر کر آتا ہے تو آپ کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ تجربہ کو، لسانیات کو یا آہنگ کو؟

فیض: بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی شعر کہتا ہے تو مختلف اوقات میں مختلف طریقے سے شعر وارد ہوتا ہے۔

نصرت: آپ کے ذہن میں پہلے کیا آتا ہے، پہلے دُھن یا ایمیج؟

فیض: میرے خیال میں پہلے ذہن میں ایک خلش پیدا ہوتی ہے تب یہ سوچتے ہیں کہ اس خلش کو الفاظ کا جامہ کیسے پہنایا جائے۔ کبھی ایک دھن بھی ذہن میں آجاتی ہے تو کبھی ایک ایمیج۔ الفاظ سے پہلے ایمیج آتی ہے جیسے ایک نظم کے بارے میں میں نے لکھا تھا، "زنداں کی شام"

......

نصرت: کچھ الفاظ آپ کی شاعری میں بار بار آتے ہیں۔ مثلاً طوق و سلاسل، بہار، دارورسن، زنداں، صبا، موسم اور بہت سے دوسرے الفاظ۔ کیا یہ الفاظ لاشعوری طور پر آپ کی شاعری کا نمایاں جزو بن جاتے ہیں یا پھر شعوری طور پر آپ انھیں استعمال کرتے ہیں؟

فیض: بالکل شعوری طور پر۔

نصرت: میرا مطلب تھا کہ جس طرح کچھ حرکات و سکنات لاشعوری طور پر ہماری شخصیت کا حصہ بن

حاوی ہیں۔ کیا اس طرح کچھ الفاظ بھی غیر محسوس طور پر ہمارے اظہار کا پیکر بن جاتے ہیں۔

فیض : شاعری میں آدمی عادتاً کچھ بھی نہیں کرتا۔ شاعری میں آپ سب کچھ شعوری طور پر کرتے ہیں۔ بار بار اگر کوئی لفظ آپ کی شاعری میں آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ تجربہ آپ کو بار بار ہوتا ہے۔ دار و رسن، ظاہر ہے کہ جب سے ہمارا ملک بنا ہے، دار و رسن کے علاوہ کچھ پیدا ہی نہیں ہوا ہے یہاں۔

نصرت : آپ ان کے علاوہ بھی تو کچھ متبادل الفاظ استعمال کر سکتے تھے ؟

فیض : ٹھیک ہے۔ متبادل الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے مگر ان کے معنی تو یہی ہوتے۔ قفس بھی استعمال ہوتا ہے، زنداں بھی استعمال ہوتا ہے، مقتل بھی استعمال ہوتا ہے مگر تجربہ تو ایک ہی ہے نا۔ میرا خیال ہے زنداں اور قفس بھی تقریباً اتنی ہی بار آیا ہوگا جتنی بار دار و رسن۔ یہ تو سننے کی بات ہے، یہ تو ایک کیفیت ہے، یعنی دار و رسن کی، زنداں کی، قفس کی، مقتل اور دشت و صحرا کی۔ اس کے مقابلے میں بہار، چمن، گلستاں وغیرہ اس تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ ایک طرف یہ ہے اور دوسری طرف وہ۔ ظاہر ہے دونوں تجربات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے یہ الفاظ بار بار آتے ہیں۔

. . . . . .

نصرت : آزاد غزل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

فیض : آزاد غزل کوئی چیز نہیں ہے۔

نصرت : آپ نے کوئی تجربہ کیا ہے اس ضمن میں ؟

فیض : جب یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے تو پھر تجربہ کہاں سے کرتا۔ آزاد غزل ایک مہمل چیز ہے جس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ غزل ایک فارم کا نام ہے، اس میں آزادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر آپ اس میں آزادی برتیں گے تو یہ کوئی اور چیز ہو جائے گی، غزل کہاں رہے گی۔

نصرت : آپ کا مطلب ہے کہ غزل میں کوئی تجربہ نہیں ہو سکتا۔

فیض : کیوں نہیں ہو سکتا۔ غزل میں تو بے شمار تجربے ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ مگر غزل کے اندر رہ کر۔ غالب نے تجربے کیے۔ استعارہ کے، تشبیہوں کے، نئے خیالات کے۔ سب سے

بڑے تجربات اقبال نے کیے مگر غزل کی فارم میں رہ کر، اس میں فلسفہ، حکمت اور باقی چیزیں لائے غزل کے فارم سے الگ ہو کر غزل میں کوئی تجربہ نہیں ہو سکتا وہ تو کوئی اور چیز ہو جائے گی۔

......

نصرت : عام طور سے یہ خیال ہے کہ آپ کی وہ شاعری جو آپ نے درِ زنداں کے پیچھے کی ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے تو اس کی کوئی بنیادی وجہ ؟

فیض : زنداں میں ظاہر ہے فرصت زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی تراش خراش زیادہ کر سکتا ہے۔ عام دنوں میں دوسری مصروفیات کے باعث آدمی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ شعر پر اتنی توجہ دے سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیل میں ایک خاص قسم کا بوجھ ہوتا ہے ذہن پر۔ ان دنوں ساری توجہ شعر پر مرکوز ہوتی ہے اور اس وقت جو آدمی شعر کہتا ہے تو یہ لگتا ہے جیسے نیا عشق کر لیا ہے کسی سے۔

نصرت : نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا ؟

فیض : بہت بڑی شاعری ہے۔ وہ اتنا بڑا شاعر تھا کہ اس نے شاعری کی زبان بدلنے کی کوشش کی، اس کے بعد کسی نے ایسی کوشش نہیں کی۔ بعد میں کئی بڑے شاعر ہوئے مثلاً غالب اقبال۔ انھوں نے تکنیک بدلی، مضامین بدلے، خیالات بدلے، مگر لغت نہیں بدلی۔ ہم نے بھی وہی لغت استعمال کی اس لیے کہ کچھ اور ہمارے ذہن میں آیا ہی نہیں۔

نصرت : اُردو شاعری کی روایت میں فراق کا بھی تو ایک مقام ہے۔ اس پس منظر میں کچھ فرمائیں۔

فیض : اردو شاعری کی روایت کے دو بڑے ستون میر اور سودا ہیں۔ میر کی جو روایت تھی اسکے بڑے نمائندہ شاعر فراق تھے اور سودا کی جو روایت تھی اسکے بڑے شاعر جوش تھے۔ یہ دونوں روایتیں اردو ادب میں ساتھ ساتھ چلی آتی ہیں۔

نصرت : میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔ آپ نے مجھے سوالوں کا بڑا اس قدر سکون سے دیا اور اتنا بہت سا وقت دیا۔

بیادِ فیض

حبیب جالب

احمد فراز

جاوید شاہین

قتیل شفائی

فہمیدہ ریاض

کشور ناہید

استاد دامن

منو بھائی

بیادِ فیض

فیض اور فیض کا غم بھولنے والا ہے کہیں

موت یہ تیرا ستم بھولنے والا ہے کہیں

ہم سے جس وقت نے وہ شاہِ سخن چھین لیا

ہم کو وہ وقتِ الم بھولنے والا ہے کہیں

ترے اشک اور بھی چمکائیں گے یادیں اس کی

ہم کو وہ دیدۂ نم بھولنے والا ہے کہیں

کبھی زنداں میں کبھی دور وطن سے اے دوست

جو کیا اس نے رقم بھولنے والا ہے کہیں

آخری بار اسے دیکھ نہ پائے جالب

یہ مقدر کا ستم بھولنے والا ہے کہیں

جالب

فیض کے فراق میں

احمد فراز
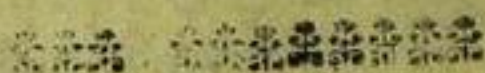
اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں
ہر سال

اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
تیری کویتا میری تیری دھرتی کی سچائی
تیرے بول ہیں سارے گونگے شہروں کی گویائی
تیرے گیت ہیں امن کی نَے اور آشتی کی شہنائی
آنگن اور چوپال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں
ہر سال

اے ماٹی کے لال

کوئی تجھے دُنیا اپنائے لیکن اپنا شہر
اپنا شہر کہ حدِ نظر تک جیسے لہُو کی نہر
یا منصُور و مسیح کی سُولی یا سُقراط کا زہر
ہم آشفتہ حال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں ہر سال
اے ماٹی کے لال
ہجر کی رت کے روز رہے گی
اور فقط کچھ روز
وصل کی ساعت آپہنچے گی
اور فقط کچھ روز
راہ کی ہر دیوار گرے گی
اور فقط کچھ روز
گلے میں بانہیں ڈال تجھے سب یاد کریں
اے ماٹی کے لال
تجھے سب یاد کریں
تجھے سب یاد کریں

فیض کی یاد میں

جاوید شاہین

جس سے لگا ہوا تھا یہ میلہ کہاں گیا
رونق پسند عشق تھا تنہا کہاں گیا

سب کے جگر میں اتری کرن رہ گئی کہاں
جو تھا نشانِ صبح وہ تارا کہاں گیا

اب ظالموں سے میرا مقدمہ لڑے گا کون
انصاف کے حصول کا وعدہ کہاں گیا

ہاتھوں میں رہ گئی ہے فقط تشنگی کی ریت
وہ بہہ رہا تھا سامنے دریا کہاں گیا

مشکل ہوا ہے دیکھنا دیوار دل کے پار
سچائی کی طرف کا دریچہ کہاں گیا

ٹھٹھرا ہوا بدن لئے پھرتا ہوں شہر میں
ان سردیوں میں دھوپ کا خطہ کہاں گیا

اب جسم کے نواح میں بکھری ہوئی ہے راکھ
دل سے نکل کے درد کا شعلہ کہاں گیا

آج کی شام فیض کے نام

خلیل شفائی

اب تک تیری یادوں کی مے چھلک رہی ہے جام بہ جام
اے ہم سب کے بچھڑے ساتھی، آج کی شام ہے تیرے نام

تو نظروں سے دُور ہے لیکن کسی کے دل سے دور نہیں
دھڑکن دھڑکن پہنچ رہا ہے۔ تیری چاہت کا پیغام

چاپ تیرے لفظوں کی اب تک صاف سنائی دیتی ہے
اب بھی تیرے پیار کا سایہ مہک رہا ہے گام بہ گام

تو نے وطن سے دُور بھی گائے گیت وطن کی عظمت کے
تیرے حصّے میں آئے ہیں پھر بھی رقیبوں کے دشنام

تو نے اپنے فن کا مرہم رکھا زخمی حرفوں پر
لیکن کچھ ناحرف شناسوں نے چھینا تیرا آرام

ظالم لوگوں نے لکھے جو اپنے دل کی کالک سے
تیری ایک خموشی نے دھو ڈالے وہ سارے الزام

بے انصافی کی اس رو کو ختم بھی ہونا ہے آخر
ہر آغاز کا پیچھا کرتا رہتا ہے اس کا انجام

ستّر سال کی عمر تیری پھیلی ہے ستّر صدیوں پر
لوح و قلم کے مالک نے لکھا ہے تیرے لئے دوام

فیض ترے مدّاحوں میں شامل اک شخص قتیل بھی ہے
جانے اس کو ملتا ہے ان سنگ زنوں سے کیا انعام
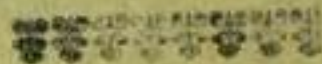
تہنیت

فہمیدہ ریاض
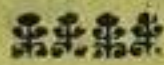
یہ مرحلہ بوئے گل سا نازک
یہ ساعت عرق سال و مہ کا
یہ وصلِ مدام کی گھڑی ہے

اے دردِ بدوش، خانہ برباد
جادہ نہ ترا، نہ کوئی منزل
جُز دیدۂ آب گوں وطن کے
جُز خلقِ وطن کا خونچکاں دل

ڈالے ہیں جہاں جہاں پڑاؤ
تھیں خیمہ فگن وہیں نگاہیں
مانندِ نفس پلٹ کے آئیں
اس مجلس میں تری صدائیں

تم سُرخ محل میں آبراجے
بے سود رہی نگاہ داری

تھا پرزہ شعر، پرزہ جاں
پروا نہ حقِ راہداری

اب یُوں ہے کہ ہر عدو سے محفوظ
باہر شبخوں کی دسترس سے
مامون حصارِ عاشقاں میں
تم منزل پا چکے ہو کب کے

"اب آؤ نہ جاؤ گے کہیں تم"
اے دربدری میں رشکِ انجم
کیا سخت غلیم پر پڑی ہے
یہ وصلِ مدام کی گھڑی۔
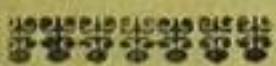
زمینِ محبت ہے تیرم دم سے

کشور ناہید

زمیں محبت ہے جس کے خوں میں
وہ اپنے ہی دیس سے نکلنے کی داستاں ہے
وہ جس کے شعروں میں غم عیاں ہے
وہ جس کے ہونٹوں کے نام کردوں
حلاوتوں کے سبھی زمانے
محبتوں کے سبھی فسانے
وہ جس نے ہر قامتِ ستم کو
قرینۂ حوصلہ سمجھ کے
تو اب آئندگان کے کشکول
کی عطا بان کے کہا تھا
کہ صبر کے دن
بہت ہی تھوڑے، بہت ہی کم ہیں
میں کیسے مانوں
کہ میری ساری ریاضتوں میں
شکستِ سازِ شبِ مسلسل

نہ بار پائے
میں اپنے گھر میں بطور قیدی ہی دن گزاروں
میں اپنے کھیتوں میں ہل چلاؤں
مگر نہ رزق زمین پاؤں
میں اپنے دیوار و در کی چھاؤں میں
دشمن وطن کو فراغ پاؤں

فیض کی موت پر استاد دامن کے اشعار
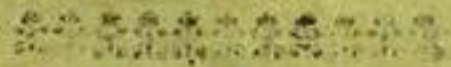
ایہہ دُنیا مثل سراں دی اے — تے مسافراں بیٹھ بھلو جانا
واری واری لے ساریاں کوچ کرنا — آئی وار نہ کسے اٹکو جانا
دامن شال دوشالے لیراں والیاں نے — بھناں خاک دے وچ سمو جانا

میرے دہندیاں دہندیاں گئی ہو گئے
تے میں کیاں دے دہندیاں ہو جانا

منو بھائی

اِک ٹُک فیض دے چشمے چوں
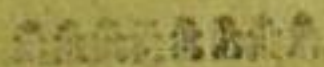
آس دا گنمبنی چھڈ دیوے تے میں قابو وچ خوف دا مرض کر لاں
سخن وراں دی اکھ بچا کے تے شاعر اپنے آپ توں فرض کر لاں
ویکھاں چک کے بھار صلیب والا، ہولا کجھ تے ساہنوں دا قرض کر لاں
چشمے فیض دے چوں اک ٹُک بھر کے، کوئی سُن داہووے تے عرض کر لاں

پے گئی شام شریکاں نے کنڈ کیتی، لال کالے دی ساتھوں پچھان مُک گئی
سوچاں تے آن ویران ہوئی، سوچ ہوٹھاں تے آئی زبان مُک گئی
داستان گو دے مُنہ چُپ لگی، اسی سمجھ بیٹھے داستان مُک گئی
ٹھنڈے چُلھے دی پھوکنی وانگ ساڈے ساہ آندے تے جاندے رہے جان مُک گئی

آئی رات تے رات دے نال آئے، جیہڑے آوندے نیں نت ہنیریاں وچ
گوڈا رکھدے پرت پلیٹیاں تے، آن بیٹھدے عشق بنیریاں وچ
وچ سعداں دے بہت بھواڑ پاندے جدوں ہوندی اے سانجھ لٹیریاں وچ
زور پلدا اے نت کمزوریاں تے، کمزوریاں میریاں تیریاں وچ

کھُلے اکھ تے نال خیال جاگے، کیوں نیندراں نے جھوکاں لائیاں نیں
دوے عقل تے سوچ سوال بن جائے سب سوچاں دے ہتھ خدائیاں نیں
دے جیبھ تے پیار دے اکھ وندے ہن تھوڑیاں ہور جدائیاں نیں
ہوئے فجر تے آکھے بسم اللہ اج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں

منتخب کلام

انتساب!

اردو شاعری کی روایت میں توانا آواز اور
[illegible] ہنگ لہجے کا نام فیض ہے۔
ان کی شاعری حرفِ حق کی ایک داستان ہے
[illegible] گنجینۂ معنی کا طلسم کھینچ زندہ حقیقتیں
[illegible] و زندگی کی قوتوں کو نمود دیتے ہیں،
فیض نے ہماری شعری روایت میں عمومی
مزاج کا اضافہ کیا ہے۔
جس سے احتجاج کی وہ طرز پیدا ہوئی جو شاعر کو
پورے معاشرتی [illegible] جبر سے نبرد آزما ہونے پر مجبور
کرتی ہے
اس میں ہار جیت کے سبھی مقام آتے ہیں، کبھی امید
کی شمع جگمگاتی ہے تو کبھی لمحہ بھر کے لئے ہر کرن اندھیرے
کی اوٹ میں چلی جاتی ہے۔
کبھی سر بلند تختہ دار سے اوپر نکل جاتا ہے۔
لیکن بالآخر فتح عزم و استقلال کی دلیل بنتی ہے کہ
جب تک جبر قائم ہے احتجاج قائم رہے گا۔
فیض کی شاعری کو ہر دور کے مظلوم عوام کی
زندگی اور نظام کے ساتھ مربوط کیا جا سکتا ہے اور یہی
[illegible] شاعری کا امتیاز ہے۔

سید جلال حیدر نقوی چیف ایگزیکٹو فکرِ نو

انتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتّوں کا بن

زرد پتّوں کا بن جو مِرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مِرا دیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کِرم خوردہ دِلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھولے جیالوں کے نام

بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے

جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے

دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے

جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے

دھجیاں ہو گئی ہے

اُن دکھی ماؤں کے نام

رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور

نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں

دکھ بتاتے نہیں

منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام

جن کی آنکھوں کے گل

چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بے کار کھِل کھِل کے

مرجھا گئے ہیں

ان بیاہتاؤں کے نام

جن کے بدن

بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے ہیں

بیواؤں کے نام

کٹڑیوں اور گلیوں، محلّوں کے نام

جن کے ناپاک خاشاک سے چاند راتوں

کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا

چوڑیوں کی کھنک

کاکلوں کی مہک

آرزو مند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو

پڑھنے والوں کے نام

وہ جو اصحابِ طبل و علم

کے دروں پر کتاب اور قلم

کا تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے

پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے

وہ معصوم جو بھولپن میں

وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لَو کی لگن

لے کے پہنچے جہاں

بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے

ان اسیروں کے نام

جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر

جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صَرصَر میں

جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں

آنے والے دِنوں کے سفیروں کے نام

وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح

اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

(نا تمام)

آکہ وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی اُلفت میں بنا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اُس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے
جس کی اِن آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصوّر میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ اُلفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
بجز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے، منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

بول
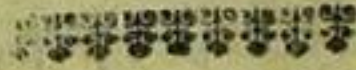
بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سُتواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ، آہن گر کی دُکاں میں
تُند ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن
کھُلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اِک زنجیر کا دامن

بول، کہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!

صبح آزادی
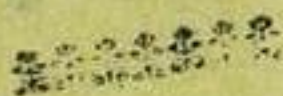
یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے

بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے، ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نُور
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام

بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

نثار میں تری گلیوں کے

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یوں ہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گِلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

AFRICA COME BACK

(ایک رجز)

آجاؤ، مَیں نے سُن لی تِرے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال

آجاؤ ایفریقا

آجاؤ، مَیں نے دھول سے ماتھا اُٹھا لیا
آجاؤ، مَیں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، مَیں نے درد سے بازو چھُڑا لیا
آجاؤ، مَیں نے نوچ دیا بے کسی کا جال

آجاؤ ایفریقا

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گُرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال

آجاؤ ایفریقا

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دُشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

آجاؤ ایفریقا

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
مَیں ایفریقا ہوں، دھار لیا مَیں نے تیرا رُوپ
مَیں تو ہوں، میری چال ہے تیرے ببر کی چال

آجاؤ ایفریقا

آؤ ببر کی چال

آجاؤ ایفریقا

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی چمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گو شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشّاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات۔
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اِتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

دل من مسافر من

مرے دل مرے مسافر

ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشناساں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

خدا وہ وقت نہ لائے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرورِ حسن سراپا نیاز ہو تیرا!
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ تیرے لیے بیقرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

چند روز اور مری جان

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حسن سے لپٹی ہُوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہُوا درد
دل کی بے سُود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
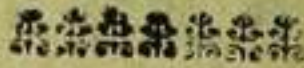
یاد

دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور۔ افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے، اے جانِ جہاں، رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گنو سب داغ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شبگیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل - جنوری ۱۹۵۹ء

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور جیل - ۱۱ فروری ۱۹۵۹ء

بلاؤ تو مقتل نادر مرا

سنئے کہ پھر بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی

رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی

آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی

آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی

"یہ دور تو تقسیم کا ہے اب سب ہی جدا ہیں ہم لوگ
کس کس کو ٹھہرائیں سرِ مقتل تلاش ہم لوگ"

آپ کا تشنہ
ایک مسیحی
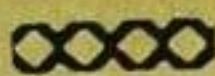
گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کُنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقامِ فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صِلا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُبھرنے لگتے ہیں

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گُل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی کا نام
اِن دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر، اُونچا ہے اُسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

تری امید، ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہمکلام کب سے ہے

لاہور۔ مارچ ۵۷ء

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

جولائی ۵۳ء — جناح ہسپتال کراچی

تم آتے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

ونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھُولے سے مُسکرا تو دیے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ وَلوَلے دلِ ناکردہ

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارہ، اب اُن کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

حیدرآباد جیل
۱۷-۲۲ مئی ۵۴ء

ہم پر تمھاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و اُلفتِ ناکام ہی تو ہے

دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے
دل نا اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات فیضؔ غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

دھنک
رنگ

کتابِ ہستی

میں نے اپنی زندگی کی کتاب کھولی
تو غم کا چیپٹر بہت اہم تھا
میں نے سوچا
کہ غم کے چیپٹر کو یاد کر لوں
ہو سکے تو
زندگی کے امتحان کو بھی پاس کر لوں

مری کہانی

نہ جانے کتنے سمندروں کے نام گنوانا پڑیں گے
کتنے صحرائے اعظموں کو ذکر میں لانا پڑے گا مجھ کو
نہ جانے کتنی کاپیوں کے ورق کالے ہوں گے ناحق
نہ جانے کتنے قلم اپنے قلم دانوں سے چل بسیں گے
مری کہانی کو لکھتے لکھتے

افسر علی افسرؔ

زرد گلاب

خواہشوں کے سراب لے کر چلتے رہے
زندگی کے صحرا میں اسے
وہ چلتی گئی، آس ڈھلتی گئی
پر ڈھلا نہ وہ سورج تپتا ہوا
نیزے کی طرح بدن میں چبھتا ہوا
چھید بڑھتے گئے، زخم رستے رہے
خواہشوں کے الاؤ سلگتے رہے
لہو اس کا، صحرا پیتا گیا
یہاں تک کہ ہوئی زندگی تمام
آبلہ پائی نے کچھ دیا نہ اسے
ایسے مٹی وہ، آ کے گرداب زمانہ میں
کہ اس کا نقشِ کفِ پا بھی نہ ملا
ہاں۔ کبھی سنہری کرنیں ریت کے ذروں پہ چمکتی ہیں
تو لگتا ہے صحرا میں زرد گلاب کھلا ہو
اس کے چہرے کی طرح

عدیلہ گیلانی۔ زواجی ڈیپارٹمنٹ

"لمحہ لمحہ خوف"

جانے اب کے تنہائی کی یہ رُت
کیسے کیسے عذاب دے کر
آنکھوں کو سلگتے خواب دے کر
دل کو ہر درد کا جواب ۔۔ دے کر
کیسی آگ لگائے گی
جانے اب کے تنہائی کی یہ رُت
ہمارے بہتے اشکوں کو منجمد کر کے
برف کی سرد سِلوں میں بند کر کے
سرد رُتوں کے برف عذابوں کی طرح
سرزمین دل پر گرتی
قطرہ قطرہ ٹھنڈک کو
زہر خند کر کے
کیسے کیسے درد جگائے گی
جانے اب کے تنہائی کی یہ رُت
ہمیں اور ہمارے جذبوں کو
ہمیشہ کے لئے سُلا کر
اپنوں کی بے وفائیوں پر
ایک بار ہی رُلا کر
شاید اس زندگی کو پھر
ہر دُکھ سے آزاد کرائے گی
جانے اَب کے تنہائی کی یہ رُت
کیا کیا
گُل کھِلائے گی۔

نکہت عالیہ خاں
اردو سال اول

بکھرے خواب

یاسمین اکبر سی
شعبۂ اردو

آج موسم کتنا سندر ہے
میرے حسین خوابوں کی طرح
دھنک رنگ بھی ہیں معطر فضا بھی ہے
اور معصوم پرندوں کی چہچہاہٹ بھی جو اس بھیگے موسم کا مخصوص گیت گا رہے ہیں
ایسا نہ ہو یہ موسم روٹھ جائے ، یہ خواب بکھر جائیں
کیوں نہ اسے سمیٹ لوں شاعری کی آغوش میں
ویسے بھی آمد کی کیفیت طاری ہے۔ جو اس موسم کا خاصہ ہے
اک خوبصورت غزل اِک حسین تخیل ذہن میں سمایا ہے
اور تصور ہی میں چائے کی خوشبو فضا میں رچ بس گئی ہے
تو پہلے چائے ہو جائے ، پھر غزل ہو جائے ،
مگر چائے تو بن نہیں سکتی
کیونکہ دودھ نہیں ہے
چلو قہوہ ہی سہی تیز خوشبو والا ، گرم بھاپ والا
مگر پتّی بھی نہیں
ارے رہنے دیجئے چائے کے بغیر بھی غزل ہو سکتی ہے
مگر آہ !
کاغذ بھی نہیں اور قلم بھی خشک ہو چکا
مہینے کا آخر ہے میری جیب خالی ہے۔
کل پہلی ہوگی ، کل تنخواہ ملے گی
مگر خدا جانے کل تلک یہ موسم رہے نہ رہے

"تم ایسی پریت میں مت پڑنا"

تم ایسی محبّت مت کرنا

تم ایسی پریت میں مت پڑنا

جس پریت میں اپنا سب کچھ تم

کھو جاؤ اور پھر پہلو میں

کچھ باتیں ہوں کچھ یادیں ہوں

اور دل کی نگری سونی ہو

تم خود کو خود میں نہ پاؤ گے

اس دنیا میں کھو جاؤ گے

پھر میری طرح تم بھٹکو گے

اور خود کو ڈھونڈھ نہ پاؤ گے

تم ایسی محبّت مت کرنا

تم ایسی پریت میں مت پڑنا

——— شازیہ کرامت ۔ شعبہ اردو سال اول

نظم۔ "ماں"

جب کبھی زیست کے پھیلے ہوئے ہنگاموں میں
اِک معصوم سے روتے ہوئے بچّے کی طرح
میں غمِ ہستی سے بھٹک جاتی ہوں
عین اُسی بے بسی کے عالم میں
تھام کر ہاتھ میرا عجب شفقت سے
مجھ کو راہِ منزل پہ لگا دیتا ہے۔
اور میں بڑھ جاتی ہوں منزل کی طرف
دھوپ ہو گر سفر بھی طویل ہو
سایہ بن جاتا ہے آنچل اس کا
رات کی تاریکی میں بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح
آشیاں کی تلاش میں پھرتی ہوں جب
روشنی بن کر جو میرے ساتھ ہوتا ہے
جو مجھے تیز ہواؤں سے بچا کر رکھے
جو مجھے جان سے اپنی لگا کر رکھے
وہ پیار بھرا ہاتھ میری ماں کا تو ہے
جو مجھے راہ منزل پہ لگا دیتا ہے
اور پھر زیست کے ہنگامے بھی
نغمۂ محبت میں بدل جاتے ہیں
اور یہ چبھتے ہوئے کانٹے بھی
پھول بن کر قدموں میں بکھر جاتے ہیں
وہ پیار بھرا ہاتھ میری ماں کا تو ہے
گود میں جس کی سارے غم
خوشی و مسرت میں بدل جاتے ہیں
وہ پیار بھرا ہاتھ میری ماں کا تو ہے

حمیرا کیانی - اردو فاضل

ھائیکو

موت کے ہاتھ کتنے ظالم ہیں
زندگانی کے آشیانے کو!
ایک جھٹکے سے توڑ دیتے ہیں

یہ جو دنیا ہے یا کہ اک جنگل
اس کے اندر سبھی درندوں سے
خوف سا مجھ کو آنے لگتا ہے

اس سے پہلے کہ موت آجائے
آؤ ہم پھر سے دوستی کرلیں
زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

کتنے اخبار بیچ کر میں نے
ایک جوڑا نیا خریدا تھا
اس کو وحشت نے پھاڑ ڈالا ہے

جانتا ہوں کہ تو نہ آئے گی
پھر بھی دل کی تسلیوں کے لئے
تیرے خط بار بار پڑھتا ہوں

افسر علی افسر

غزل

پھر کسی کی یاد میں آنسو رواں ہونے لگے
جو چھپائے تھے وہ قصّے پھر بیاں ہونے لگے

سنگ ریزوں سے مجھے پھر سے عقیدت ہو گئی
پھر کسی کے گھر کے رستے کہکشاں ہونے لگے

کون گزرا ہے مرے احساس کی دہلیز سے
پھر کیوں در و دیوار سے خدشے عیاں ہونے لگے

پھر کیوں تصور میں وہی تصویر یاد آنے لگی
کیا پھر کسی کی آنکھ کے جادو جواں ہونے لگے

پھر سیاہ بختی کے در پہ کون دستک دے گیا
پھر مجھی سے میرے سائے بدگماں ہونے لگے

لوٹ کے چاہتا ہے دل صحرا ہوں یا جنگل کہیں
پھر جنوں کے سب تقاضے ہم زباں ہونے لگے

چھوڑ آئی تھی جنہیں مدت ہوئی ہے دوستو!
پھر انہیں گلیوں کے پتھر مہرباں ہونے لگے

ماشدہ قاضی۔ اردو اول

غزل

بڑھ گئی بے تابئ دل اور بھی !
ڈوبتے سورج کا منظر دیکھ کر

سوچتا ہوں بدل جاؤ نہ تم
دوستوں کے آج تیور دیکھ کر

لُٹ گیا ہے دل سبب پوچھو نہ تم
وحشتیں بڑھتی ہیں کھنڈر دیکھ کر

جانتا ہوں کتنا گہرا گھاؤ ہے
پھر بھی خوش ہوں اس کو خوشتر دیکھ کر

ہجر کی راتیں ہیں اور تنہا سفیرؔ
دیکھتا ہے باہر، اندر دیکھ کر

سفیر حسین خاں - ایم فل ریاضی

ہم نے تم سے پیار کیا، اظہار مگر ہم کر نہ سکے
دل تم پہ اپنا وار کیا، اظہار مگر ہم کر نہ سکے

ابھی ٹھہرو بھی ابھی جاؤ نہ، کیوں جانے کی تمہیں جلدی ہے
شب وصل ابھی کچھ باقی ہے، تکرار مگر ہم کر نہ سکے

یہ دنیا اِک بازارِ وفا یہاں ہر کوئی بیوپاری ہے
اک ہم ہی سچے عاشق ہیں، بیوپار مگر ھم کر نہ سکے

یہ دنیا اِک دیوار ہے جو حائل ہے دو دِل والوں میں
دیوار یہ اب تک قائم ہے، مسمار مگر ھم کر نہ سکے

محبت جرم عظیم سہی، دستور بنا یہ دنیا کا
انکار تو جرم سے کر دیتے، انکار مگر ھم کر نہ سکے

محمد عظیم قریشی (ایم بی اے)

غزل

نسیم فاطمہ خاں
شعبہ کیمسٹری

پھیلا ہے دست چاہت خیرات کے لئے
ہے منتظر غریبی عنایات کے لئے

اوروں پہ جا کے برسے بادل خلوص کے
ہم نے دعا جو مانگی برسات کے لئے

لگتا ہے ہم پہ نظر کرم ہی اٹھ چلی
کتنی دعائیں مانگی ہیں حاجات کے لئے

خالی پلٹ کے آئے اُن کے دیار سے
ہم بھی چلے تھے گھر سے سوغات کے لئے

ایسا نہ ہو کہ داغ رفاقت ملے نسیمؔ
کچھ اہتمام کر لو حالات کے لئے

معظم خاں رانا
شعبہ انگلش

غزل

لب پہ فغاں ہے آنکھ ہے پُرنم ترے بغیر
ہیں تنگ زندگی سے بہت ہم ترے بغیر

اُن مہر و ماہ و کوکب و انجم کا ذکر کیا
گریہ کناں ہے سبزہ و شبنم ترے بغیر

دیوار و در سے پوچھ میرے دل کی داستاں
کیسے گزارتا ہے یہ پُرغم ترے بغیر

میں ہی پریشاں حال نہیں ہوں فراق میں
ہر سو بپا ہے حشر کا عالم ترے بغیر

تجھ کو تو پھرنی تھیں نگاہیں سو پھیر لیں
اب یہ بتا کہ کیسے جئیں ہم ترے بغیر

رخصت ہوا وہ رانا مگر کس سے ہم کہیں
آ جا نظامِ دہر ہے برہم ترے بغیر

میری ذات سے نہ ہو بدگماں میں ہوں باوفا اسے بھول جا
کہ وہ کون تھا مرے ساتھ کل مجھے کیا پتہ اسے بھول جا

یوں نہ دیکھ اجڑے دیار کو دلِ غمزدہ دلِ زار کو
تو یہ دیکھ تیرا ہی شہر تھا جو اجڑ گیا اسے بھول جا

یہ نہ سوچ کوئی غریب ہوں ترے دیکھ کتنا قریب ہوں
دلِ اجنبی دلِ غیر سے تجھے کیا ملا اسے بھول جا

تجھے راستے میں ملا تھا جو ترے ساتھ ساتھ چلا تھا جو
وہ جو ایک پل کا ہم سفر وہ بچھڑ گیا اسے بھول جا

مری داستاں کو نہ چھیڑ اب مرے بعد کچھ نہ بیان کر
یہ سمجھ کہ تیرا خیال سو وہ مر گیا اسے بھول جا

———— افسر علی افسر

غزل

عدیلہ گیلانی
(زوالوجی ڈیپارٹمنٹ)

پیار ہے مجھے تم سے اے دوست میری
یہی تھی بات جو اس نے ہمیں بتلائی تھی

جھوٹ تھا یہ سب — فریب تھا
اس کی سرشت میں تو بے وفائی تھی

بندھن ہے کچے دھاگوں کا ٹوٹ جائے گا
یہ بات میں سمجھ نہیں پائی تھی!

اعتبار کیا تھا اس پہ سب سے بڑھ کر
یہ نہ معلوم تھا کہ وہ ہرجائی تھی

من آنگن میں پیار کی شمع روشن تھی
ہوا نے نہیں، خود اس نے بجھائی تھی

وہی — پہچان نہ سکے ہم کو
جن سے برسوں کی آشنائی تھی

ایسا تھا کچھ طرز تکلم ان کا!
جانے کیوں — آنکھ بھر آئی تھی

ملے ہی نہ ہوتے — اے کاش
گر ہماری قسمت میں جدائی تھی

میرا غم میری تنہائی کہتے ہیں مجھ سے
تو ہی نادان تو ہی شیدائی تھی

ہم نے کیوں اس کو اپنا جان کر
وہ ایک لڑکی، جو پرائی تھی!

غـــــزلیں

کبھی کبھی جو ہمیں بے وفا سا لگتا ہے
خزاں رُتوں میں بھی بادِ صبا سا لگتا ہے

سنائیں کیا تجھے اے دوست آج قصۂ غم
گزر رہا ہے جو ہر پل، سزا سا لگتا ہے

بچھڑ گیا ہے وہ عرصہ ہوا مگر اب بھی
اسی کی یاد کا موسم بھلا سا لگتا ہے!

کچھ اس طرح سے لُٹے دِل کے قافلے اُن کے
وفا کے نام سے اب تو ڈرا سا لگتا ہے

مرے خیال میں وہ بدگمان ہے کوثرؔ
نظر ملاتا ہے جب بھی خفا سا لگتا ہے

تسنیم کوثر۔ اردو فائنل

ملتا صلہ ضرور ہے صبر و رضا کے بعد
جنّت کے ہم امیں ہیں روزِ جزا کے بعد

میں خواب بُن رہی ہوں نئی کائنات کے
تیرا تو شوق پورا ہو مری فنا کے بعد

چہرہ بھی پُر ملال تھا جاں پر بنی ہوئی
آیا میری خبر کو ستمگر قضا کے بعد

میں نے خدا سے جب بھی مانگا ہے تیرا پیار
ہاتھوں سے اک مہک سی آئی دُعا کے بعد

مولائے دوجہاں کے کرم کا یہ فیض ہے
حمیراؔ دُعا قبول ہوئی ہر دُعا کے بعد

حمیرا کمال
اردو فائنل

MY LOVE IS FOR YOU - AND ONLY FOR YOU.

شکل بری ہے کم از کم بات تو اچھی کر لیا کریں ۔

چلیے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

اپنا ہیر سٹائل تبدیل کر لیں

تم سلامت رہو ہزار برس ۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ڈانٹا نہ کریں

کاش تم میں منافقت نہ ہوتی

اِدھر اُدھر تاک جھانک مت کیا کریں ۔

تیری ذات ہو تیرا نام ہو ، مجھے لطف دے تیرا ہر سخن

میں اسی میں ہر دم رہوں مگن میرے جی میں تیرا خیال ہو

میس والو! ڈیڑھ مہینہ بیتنے کو آیا آخر دال چھوڑے کب تک

رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے

دور پھولوں کی طرح مہکے اگر تو آئے

وقار اور خودداری ایسا تصور ہے جو غلامی کی زیست سے آزاد ہوتا ہے ۔ اگر چاہتے ہو تو ان دو کو اپنا لو ۔

جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں کہ میری پسندیدہ شخصیت حسن کے دیس میں رہتی ہے اور یہ رسالہ وہاں نہیں پہنچ سکتا ۔

سب کو قبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا

اگر آپ غلط فیصلہ نہ کرتے تو لوگوں کے مستقبل برباد نہ ہوتے ۔

بے پردہ میرے سامنے آؤ تو بات ہے

کاش وہ ایسا نہ کہتے کہ نہ مجھے کسی پر غصہ ہے اور نہ کسی سے لگاؤ ۔

بگڑے کے نام کہ اتنی معصوم صورت کے ساتھ دھینگا مشتی کیا کرو مجھے رونا آجاتا ہے

محمد عظیم قریشی ایم بی اے

روبینہ طاہرہ شماریات سال اول

شفقت زہرا کیمسٹری

فرح دیبا اردو سال اول

پروین اختر اردو فائنل

ناہیدہ خانم اکنامکس سال اول

فوزیہ ناہید ۔ اردو فائنل

زرینہ رشید باٹنی

نبیلہ چوہدری ریاضی

طاہرہ لطیف فزکس سال اول

عارفہ روبینہ ہسٹری فائنل

ثمینہ اسلم اردو فائنل

سید نوید باقر انگریزی

مسرت انیس اردو سال اول

عشرت شبانہ اردو فائنل

جلیل خان اسلامیات

کشور سلطانہ اردو سال فائنل

گل حسن ۔ شماریات

پیغام	نام
میں نے کہا تھا نا محبت میں رازداں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ رازداں ہی ہمیشہ محبتوں کو لے ڈوبتے ہیں۔ اب تو تمہیں یقین آ گیا ناں۔	زیب النساء اردو سال اول
جان جلتی ہے نظر ایسے چرایا نہ کرو ہم غریبوں کے دکھی دل کو دکھایا نہ کرو	ریاض راؤ اکنامکس فائنل
عمران خان کے نام: پلیز آپ تین چار سال تک ریٹائرمنٹ مت لیں۔	فرح اشرف اکنامکس
میرے پیارے والدین اور سویٹ بہنیں اور بھائی۔ میں آپ سب سے بے انتہا (اگر اس سے زیادہ ہے کوئی لفظ) محبت کرتی ہوں۔	سمیعہ ناز۔ ایم بی اے
میرے پیارے دوست! خدا تجھے اعلیٰ مقام دے آمین اللہ ہی اللہ کیا کرو	آصف صدیقی مطالعہ پاکستان ثمینہ ظفر - اسلامیات
ان اشعار کے پردے میں میں جن سے مخاطب ہوں سمجھ تو گئے ہوں گے کیوں نام لیا جائے میں نے جب لکھنا سیکھا تھا پہلے تیرا نام لکھا تھا	انوار احمد قریشی مطالعہ پاکستان صباحت مشتاق اردو سال اول
پیغام تو کوئی نہیں البتہ درخواست ہے کہ ہم اتنے برے بھی نہیں ہیں۔	محمد اعظم انگریزی سال اول
جہاں کہیں بھی ہو، واپس آجاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا	زاہدہ بلوچ زوالوجی۔ فائنل
ہمیشہ مسکراتے رہو اور کینٹین پر آتے رہو	اعجاز الحق چوہدری ایجوکیشن
جلدی سے ایم۔ ایس سی کر لو	فرحانہ تبسم اردو سال اول
کاش وہ پڑھاتے وقت گھڑی کی طرف بھی دیکھ لیا کریں۔	رضویہ منصور اردو سال اول

اپنی پسندیدہ شخصیت کے نام پیغام	نام و شعبہ
میرے رفیق! میرے رازداں! میرے ساتھی	طاہرہ تجمل
میں تیرے ذہن پہ تجھ کو دعائیں دیتا ہوں	عربی
اگر فلیش نہ کرنا آئے تو نہ کیا کرو	غلام مصطفیٰ چوہدری
	سیاسیات فائنل
تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا	عریاض خان صنوبر
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں	انگلش فائنل
خاک ہو جائیں گے ہم تجھ کو خبر ہونے تک	سلیم خان نیازی انگلش
خدا کی قسم محبت نہیں عقیدت ہے	انیلا زریں
دیارِ دل میں بڑا احترام ہے تیرا	فارمیسی
حسینہ معین کے نام۔ خدا زورِ قلم اور بڑھے	بشریٰ شاہین عزیز
	ایجوکیشنل فائنل
میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ میری بات	سلوا نا ندیم
خوشبو کی طرح اڑ کے تیرے دل میں اتر جائے	فارمیسی
امی ابو کے نام۔ اس ویک اینڈ پر گھر آ رہی ہوں	راشدہ بھٹہ
	انگلش سال اول
تعلیم حاصل کرنے میں بہت محنت کرو۔ کیونکہ ہم دونوں کو	محمد امجد اعظم
بہت بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔	مطالعہ پاکستان سال اول
ڈیئر عمران خان۔ یوں ہی ریکارڈ پہ ریکارڈ بناتے جاؤ اور	ظفر چوہدری مرحوم
ریٹائرمنٹ کا نام ہی نہ لو۔	اردو سال اول

ایک نہیں کئی پسندیدہ شخصیات ہیں۔

ریحانہ خلیل
ایجوکیشن سال اول

کس کس کو پیغام دوں
زندہ لوگ پسندیدہ نہیں ہوتے اور مردے
پیغام نہیں سنتے۔

خالد عمر کنور
فارمیسی

جہاں رہیں خوش رہیں

شبنم گل - اسلامیات

میری دعا ہے کہ وقت کا ہاتھ ہمیشہ تیری دسترس میں ہے
تو جہاں بھی رہے کامیابی سدا تمہارے قدم چومتی ہے۔

فریحہ غزل
اردو فائنل

خدا آپ کو نظر بد سے بچائے

حافظ عبد المجید
اکنامکس فائنل

اس سے کہنا کہ چھبیس جنوری پھر سے لوٹ آئی

فرخندہ کوثر اردو فائنل

سر رؤف صاحب! کبھی پڑھانے کے دوران وقت بھی
دیکھ لیا کریں۔

فوزیہ شیخ
اردو سال اول

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

بشریٰ مشتاق
سال اول

اللہ میاں جی! اگر تو کسان سے ناراض ہوتا ہے تو اسے حسین
بیٹی دے دیتا ہے۔ اگر بیٹی سے ناراض ہوتا ہے تو اسے
زمیندار کے گھر پیدا کرتا ہے۔ ہمارا قصور؟ . . .

راشدہ قاضی
اردو سال اول

خوش خوش رہا کرو

افسر علی افسر اردو فائنل

خدا کرے کہ آپ کے یہ خوبصورت لب ہمیشہ یونہی مسکراہٹوں
کے پھول نچھاور کرتے رہیں۔

خالد نوید بھٹی
اردو سال اول

سر انور! جب سے آپ چیئرمین بنے ہیں تو ہم تو آپ سے
بات کرنے کو ترس گئے۔

حمیرا کمال
اردو فائنل

پسندیدہ شعر

سروے

پسندیدہ اشعار	نام و شعبہ
؎ وہ جن کے دل میں نہ اترے تھے درد کے نشتر وہ پتھروں کے مسیحا گلاب کیا دیتے!	طاہرہ تجمل - عربی
؎ قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل فقط ان سے کہنا کہ آنکھیں ترس گئیں	غلام مصطفےٰ چوہدری سیاسیات فائنل
؎ خامشی معرفت کا سرمایہ بات اظہار کا تماشہ ہے	محمد عیاض خان صنوبر انگلش فائنل
؎ گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن بہت اداس بہت بے قرار گزرے گی	سلیم خان نیازی
؎ چڑھتے سورج کے پجاری نہ بنو اپنے سائے میں سما کر گزرو	مسرت انیس اردو سال اول
؎ زمیں سے کون اٹھاتا ہے سوکھے پتوں کو ہوا کی بات نہ کرنا ہوا تو پاگل ہے	طاہرہ لطیف فزکس سال اول
؎ دوستوں کے ہجوم میں ناصر میرے اندر کا شخص تنہا ہے	نبیلہ چوہدری ریاضی
؎ ہمیں خبر ہے کہ ہوا کا مزاج رکھتے ہو مگر یہ کیا کہ ذرا دیر کو رکے بھی نہیں	زرینہ رشید باٹنی فائنل

اظہارِ تشکر
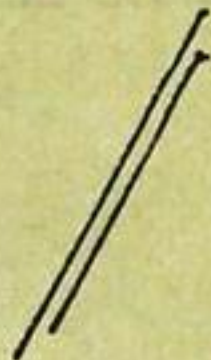
ہم اس شمارے کی تیاری کے سلسلے میں سلیمہ ہاشمی کے مشکور و ممنون ہیں کہ جنھوں نے نکرِ نو کے فیض نمبر کا سرورق کی تصویر فراہم کی۔

اور جناب ڈاکٹر خلیق انجم۔ جناب صلاح الدین حیدر جناب اعجاز کریم اور جناب ماجد حسین گوندل کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں کہ جنہوں نے اس پرچے کی تیاری میں ہماری بھرپور مدد کی
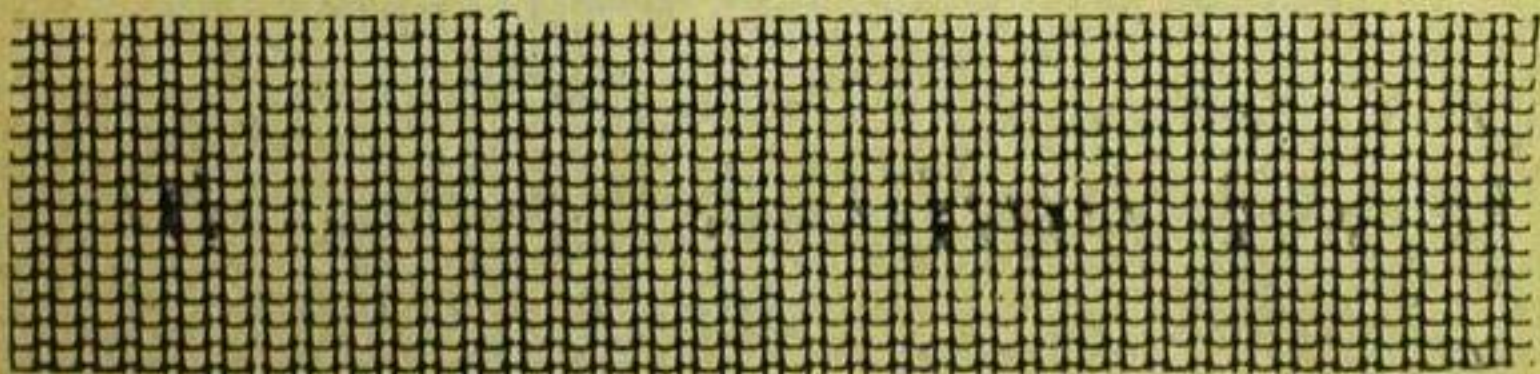
جب تک ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

نسیم اختر
ایجوکیشن فائنل

ہم تم جدا ہوئے تو کسی کو خبر نہ تھی
مڑ مڑ کے دیکھنا ہمیں برباد کر گیا

عابدہ متین
انگلش سال اول

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

عابدہ عبدالرحمٰن
باٹنی فائنل

میری زندگی کا مقصد سمجھ سکو تو کہہ دوں
میری زندگی کا مقصد ہے دوستی نبھانا

فرزانہ جبیں
فارمیسی

لا کے موجوں نے بھی ساحل پہ ہمیں چھوڑ دیا
ہم نے چاہا کہ کناروں سے کنارا کرلیں

عظمیٰ بھٹی
اردو فائنل

اے فرشتو! یہ سیاہ نامۂ اعمال ادب سے لاؤ
اس میں اِک میرے محمدؐ کا قصیدہ ہوگا

رخشاں طاہر سعیدی
اردو سال اول

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا اسے دیکھ اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل سر آئینہ اسے بھول جا

فریدہ سیال
اردو سال اول

تجھ کو چاہا تھا تیری ذات کو سجدہ نہ کیا
وہ میرا عشق تھا یہ میری خودداری ہے

سردار عقیل محمود
مطالعہ پاکستان فائنل

رِستے ہوئے زخموں کے سوا کچھ نہ دے سکا
قسمت کا دیوتا بھی شاید غریب تھا

یاسمین کمال
فارمیسی

اپنی خوشی کے ساتھ میرے غم بھی نبھاہ لو
اس زور سے ہنسو کہ آنسو نکل پڑیں

خواجہ شفقت اقبال
اردو فائنل

ڈوبنے کا غم نہیں مگر افسوس تو اس بات کا ہے
سفینہ جہاں میرا ڈوبا وہاں بہت کم تھا

ریحانہ کوثر
اسلامک سٹڈیز

؎ پاتے ہیں کچھ گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے پتھروں سے خوشبو کبھی کبھی

زاہدہ خانم
اکنامکس سال اول

؎ خود نمائی نہیں شیوہ اربابِ وفا کا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

پروین اختر
اردو فائنل

؎ سوچا تھا اس نے رات کی چُپ میں مجھے ملے
لیکن ہوا نے راہ میں پتے گرا دیئے

شفقت زہرا
کیمسٹری

؎ بٹ جائیں گی کرچیاں بھی تیرے وجود کی
مجھ کو نہ توڑ دیکھ تیرا آئینہ ہوں میں

روبینہ طاہرہ
سال اول سٹیٹ

؎ اے میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا

فرحانہ تبسم
اردو سال اول

؎ اخلاص، مروت سب رسمی رسمی باتیں ہیں
ہر شخص خودی کی مستی میں بس اپنی خاطر جیتا ہے

زاہدہ بلوچ
زوالوجی فائنل

؎ ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تو نے تو خیر بے وفائی کی

صباحت مشتاق
اردو سال اول

؎ پیار پہ میرا بس تو نہیں ہے لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

انوار احمد قریشی
مطالعہ پاکستان

؎ شرما گئے لجا گئے نیناں چرا گئے
اے عشق مرحبا وہ یہاں تک تو آ گئے

ثمینہ ظفر
اسلامیات

؎ جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

زینت بانو
اردو فائنل

؎ اداسیوں کے سفر میں اگرچہ فاصلے بھی تھے
وہ دور مجھ سے رہ کے بھی مرے قریب تھا

فریحہ غزل
اردو فائنل

~ اس شخص سا تیس منافق نہیں کوئی جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا	راشدہ بھٹو انگلش سال اول
~ اپنا دل، اپنی نظر، اپنی طلب، اپنی پسند ہم نے اس حسن کو چاہا ہے جسے دیکھا بھی نہیں	سلوانا ندیم فارمیسی
~ خود پیاس کا دریا ہوں مگر دل کی یہ ضد ہے ہر دشت پر ساون کی طرح ٹوٹ کے برسوں	رضیہ منصور اردو سال اول
~ ٹوٹ جاتے ہیں بکھر جاتے ہیں کانچ کے گھر میں مقدر اپنے	عارفہ روبینہ ہسٹری فائنل
~ آج پھر ٹوٹیں گی اس کے گھر کی نازک کھڑکیاں آج پھر دیوانہ اس کے شہر میں دیکھا گیا	سیف اللہ راٹھور مطالعہ پاکستان
~ مجھے عادت ہے نماز شام گھر پر پڑھنے کی میری میت کو دفنانا غروب آفتاب سے پہلے	انجم الماس ایجوکیشن ایم ایڈ
~ وہ میرے سامنے بیٹھا تھا لیکن میرا نہ تھا فاصلے کچھ ایسے بھی ہوں گے کبھی سوچا نہ تھا	الطاف حسین خالد اکنامکس فائنل
~ کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش	محمد صالح انجم ہسٹری فائنل
~ ہم محبت میں بھی توحید کا قائل ہوں فراز ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھا	نسرین قریشی اردو سال اول
~ کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کب تک جو تمہیں بھلا چکا ہو اسے تم بھی بھول جاؤ	ناصر حسین بخاری مطالعہ پاکستان فائنل
~ میں کسی کے دست طلب میں ہوں تو کسی کے حرف دعا میں ہے میں نصیب ہوں کسی اور کا مجھے مانگتا کوئی اور ہے	عبدالوحید مطالعہ پاکستان

کہاں آ کے رُکنے تھے، کہاں موڑ تھا اُسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا

سمیعہ ناز
ایم بی اے

اندر کے میلے پن کا کیسے ملے سراغ
اندازہ لوگ کرتے ہیں اُجلے لباس سے

فرح اشرف
اکنامکس

میں اسی خیال سے آج تک تجھے دل بات نہ کر سکا
کہ تو دردِ دل سے ہے نا آشنا کہیں مسکرا کر نہ ٹال دے

راؤ ریاض
اکنامکس فائنل

میرا سکوں یہی ہے کہ میں بے سکوں رہوں
میرے لئے نہ کوئی پریشاں ہوا کرے

زیب النساء
اردو فائنل

اسی کا شہر وہی مدعی وہی منصف
ہمیں یقین تھا، ہمارا قصور نکلے گا

خالد نوید بھٹی
اردو سال اول

میں تجھ سے اور تو مجھ سے نہ مل سکے گی کبھی
ہمارا پیار بھی دو انتہاؤں جیسا ہے!

افسر علی افسر
اردو فائنل

کیا دکھ تھے کون جان سکے گا نگارِ شب
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے

راشدہ قاضی
اردو فائنل

کل کا دن کس نے دیکھا ہے آج کا دن کھوئیں کیوں!
جن گھڑیوں میں ہنس نہیں سکتے، اُن گھڑیوں میں روئیں کیوں

فوزیہ شیخ
اردو سال اول

محبتیں تو خود اپنی اساس ہوتی ہیں
کسی کی بات کو اپنی اساس مت کرنا

فرخندہ کوثر
اردو فائنل

پرانی باتوں کا کیا ذکر اس زمانے میں
اندھیرا اب نہیں ہوتا کہیں چراغ تلے

شبنم گل
اسلامیات

میرا عزم تو تھا بلند تر اسے حادثوں نے مٹا دیا
میں مسافتوں میں بکھر گئی مجھے راستوں نے گنوا دیا

ریحانہ خلیل
ایجوکیشن سال اول

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری تحقیر ہوتی ہے!
میں مسجودِ ملائک ہوں مجھے انسان ہی رہنے دو

نگہت عالیہ خاں
اردو سال اول

غم کے سنجوگ اچھے لگتے ہیں
مستقل روگ اچھے لگتے ہیں
وعدہ وفا نہ کر کے مجھے
بے وفا لوگ اچھے لگتے ہیں

عارف عمران
اردو فائنل

کچے گھڑے بہت ہیں مگر رات کا سفر
کٹتا ہے میری جان ہر اک ابتلا کے بعد

نائلہ ثمر
اردو فائنل

جو دھن ساز سے نکلی ہے وہ سب نے سنی ہے
جو تار پہ گزری ہے وہ کس دل کو پتہ ہے

صائمہ غنی
مطالعہ پاکستان

پرواز رکھ بلند اپنی کہ بن جائے تو عقاب
چڑیوں کی طرح دانے پہ تو گرتا ہے کس لئے

محمد اطلس خاں
مطالعہ پاکستان

کس کس کو اپنی اپنی رفاقت پہ ناز ہے
ہوتا ہے کون کون جدا دیکھتے رہو

عارف محمود
اردو فائنل

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

یاسمین صغریٰ
ایجوکیشن سال اول

وہ جو زہرہ جبیں ہوتے ہیں
کتنے ناز آفریں ہوتے ہیں

ناصر نیاز۔
مطالعہ پاکستان سال اول

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اظہر الیاس
مطالعہ پاکستان فائنل

رفاقتیں کبھی زنجیر پا نہیں ہوتیں
نہ چل سکو تو بچھڑ جاؤ دوستوں کی طرح

تنویر مرزا
اردو فائنل

ان کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

کچھ اس لئے بھی میں اس سے بچھڑ گیا محسن
وہ دور دور سے دیکھے ٹھہر ٹھہر کے مجھے

کہہ دیا ہے شور دریا سے یہ سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

فضا میں پھیل چلی میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں

خاموشی سہی مرکزی کردار تو ہم تھے
ہم بھلا کیسے تیری کہانی سے نکلتے

ثمرین انجم
خاد عیسی
عارف گل
ریاضی فائنل
فرحانہ منظور
اردو فائنل
شاکر
اسلامک سٹڈیز
ظفر زیدی

نیا

رنگ

بفیضِ فیض ۔۔ صلاح الدین حیدر کی تحقیقی آزمائش

تحریر :- اَسد فیض

تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کے عوام کا یہی مقصد ہے کہ ان کی تگ و دو کی ڈور اور زندگی موت کے فیصلے انکے اپنے نہیں ہوتے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جبر کا نظام انسانوں کو مطیع اور اپنا غلام بنانے کے لئے ان پر نافذ کر دیا جاتا ہے آزادی کی تمام تحریکوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اس کڑی دھوپ کے سفر میں جب لب مہر بند ہوں اور سانسوں پر بھی پہرے ہوں تو سب سے زیادہ جو طبقہ معتوب ٹھہرتا ہے وہ اس قوم کے دانش ور اور ادیب ہوتے ہیں جو عام لوگوں کے مقابلے میں اپنی دھرتی کے کچھ زیادہ قریب ہوتے ہیں اور وطن کی محبت ان کی سانسوں میں رچی ہوتی ہے پھر کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے جذبے جبر کی قوتوں سے ماند پڑ جائیں اور انہیں بھی روپوش نباد با جائے

ان ہی میں ایک نام ملتان کے ایک دانش ور اور ادیب صلاح الدین حیدر کا ہے وہ آج بھی ہر نئے والے کو تھک اور سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اردو شاعری کی روایت کے منفرد شاعر فیض احمد فیض پر تحقیق کر رہے ہیں اور اس لحاظ سے ان کا رشتہ بھی فیض کے راستے سے جا ملتا ہے کہ انہیں بھی فیض کی طرح ہی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں بلکہ جب ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں تو انہیں فیض کے اس مصرعے کی معنویت نے سرشار کر دیا " آج بازار میں پا بجولاں چلو " اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں تفصیلات بتلاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بچپن میں دسویں کلاس تک میں نصرت الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا رہا پھر ولایت حسین کالج سے بی اے اور گورنمنٹ کالج بوسن روڈ سے اردو میں ایم اے کیا۔ اس دوران تعلیمی کیریئر اوسط درجے کا رہا اس لئے کہ بچپن سے ہی نصاب سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہو سکی تھی اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ دراصل نصاب کو بنایا ہی غیر دلچسپ گیا ہے جبکہ بچپن سے ہی ادب پڑھنے کا شوق تھا اس لئے کہ یہ مجھے حقائق کے قریب معلوم ہوتا تھا

فیض احمد فیض سے اور ان کی شاعری سے دلچسپی کی کیا وجوہات تھیں کالج میں ماجی کرنالی میرے استاد تھے اور انہوں نے میرے لئے سدا راہنمائی کی اور پہلی کتاب جو میں نے لائبریری سے لیکر پڑھی وہ فیض صاحب کی دست صبا تھی اسکے علاوہ ترقی پسند حوالوں سے بھی فیض مجھے بے حد پسند تھے ان کی شاعری زندگی کی حرارتوں سے بھرپور ہے اس کے بعد افکار کا "فیض نمبر" جب چھپ کر آیا تو ان کے فن و شخصیت کے کچھ اور گوشے واہوئے

گزشتہ گیارہ برس کے دوران جو ادب تخلیق ہوا اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

گزشتہ گیارہ برس مارشل لا کے نام سے پاکستان کے لوگوں پر جو جنگ مسلط کی گئی تھی یہ محض اتفاق نہیں نہیں بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا سلسلہ تھا جس کے ذریعے کئی مقاصد حاصل ہوئے اور آئین کا سب سے بڑا نقصان ملک کے باشعور طبقے کو پہنچا ان پر مختلف تجربات کئے گئے انہیں جسمانی تشدد کے ذریعے ڈرایا دھمکایا گیا اور میں بھی اس کی زد میں آیا بہت سے اور لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے اور اردو نثر اور شاعری میں علامتی انداز میں اس بارے میں بہت کچھ لکھا گیا

آپ اپنی قید و بند کے بارے میں کچھ تفصیل بتائیں گے ۔

جبر کے خلاف مزاحمت مجھے ورثے میں ملی ہے میرے والد خاکسار تحریک سے وابستہ تھے اور انہوں نے بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور معاشی بدحالی کا سامنا بھی کرنا پڑا ۱۹۸۴ء میں مجھے ملتان سے گرفتار کیا گیا ۔ مجھے پہلے ملتان جیل پھر شاہی قلعہ لاہور اور بعد میں اٹک جیل میں رکھا گیا تھا میں ایک لکھنے پڑھنے والا شخص تھا لیکن مجھ سے ایسا سلوک کیا گیا جیسے میں بے حد خطرناک مجرم ہوں مجھ پر الزام تھا کہ میں ملک کے خلاف ہوں میں سمجھتا ہوں کہ اس دھرتی سے میرے رشتے بہت ہی گہرے ہیں اور ان کی جڑیں بے حد مضبوط ہیں ۔ میں ہر چیز سے اختلاف رکھ سکتا ہوں لیکن محب وطن ضرور ہوں اس تفتیش کے اثرات مجھ پر گیارہ سال میں جو صورت رہی اس سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک لکھنے پڑھنے والا ۔ حالت جنگ میں ہوں یا محاصرے میں آیا ہوا شخص ہوں

فیض صاحب سے کبھی ملاقات کا موقع ملا ،

۱۹۷۲ء میں فیض صاحب سے ایک کتاب کی تعارفی تقریب میں ملاقات ہوئی تھی ۱۹۷۶ء

میں امروز ملتان کے دفتر میں ملنے کا دو بارہ اتفاق ہوا۔ وہ جب ملتان آتے تو محترمہ غفلت زکی کے ہاں ٹھہرتے تھے وہاں ان سے گپ شپ رہتی تھی وہ بے حد محبت کرنے والے انسان تھے تاریخ کا آتش فشاں ان کے اندر تھا جس کو عام آدمی نہیں سمجھ سکتا متعدد بار ملاقاتوں کے بعد ان سے دوستی محسوس ہونے لگی تھی میری رائے میں تاریخ کی بڑی شخصیتیں عام انسانوں کے بے حد قریب ہیں کچھ ایسا ہی احوال فیض صاحب کا تھا۔

آپ فیض احمد فیض کی فن و شخصیت پر تحقیق کر رہے ہیں یہ کام کہاں تک پہنچا اور اس سلسلے میں آپ کو کیا دشواریاں پیش آئیں رہائی کے بعد یوں لگتا تھا کہ میں کبھی نہیں لکھ سکوں گا مجھ پر ایسا نفسیاتی ذہنی دباؤ ڈالا گیا تھا۔

دوستوں نے حوصلہ دیا تو لکھنے کا شوق پیدا ہوا اب تک تین ابواب مکمل کر چکا ہوں امید ہے اس سال کے آخر تک کام مکمل کر لوں گا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ فیض صاحب کے بارے میں ذاتی شخصیت کے حوالے سے زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں

آپ نے اب تک جو تحقیق کی اس میں فیض احمد فیض کی شاعری کے بارے میں کوئی نئی جہت دریافت کی

فیض احمد فیض کی غزل گوئی پر جو لکھا ہے اس میں غزل کی قدیم روایت کو دریافت کیا ہے تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری غزل گوئی ہی میں زندان کے تمدن کے خلاف مزاحمت ملتی ہے اور یہ نظام بھی زندان ہے فیض احمد فیض نے اسے علمی سطح پر شعوری تاریخوں کو مربوط کیا ہے

دراصل تاریخ کے تقاضوں کو علمی سطح پر مربوط نہیں کریں گے تو تحریکیں ختم ہو جاتی ہیں

فیض احمد فیض کی شاعری انسانی صورت حال پر مبنی ہے یہ سیاسی حکمت عملی کی نہیں انسانی حقوق کی جدوجہد کی شاعری ہے ہمیں شاعری سے سیاسی بینٹو نہیں تراشنے چاہیئے

اور فیض کی علامتی شخصیت پر تاریخی حوالوں سے نئے تناظر میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔

کوکا کولا
ٹریڈ مارک رجسٹرڈ
ہی تو ہے!
Coca-Cola
It's the real thing.
MULTAN BEVERAGES COMPANY(PVT)LTD.
VEHARI ROAD MULTAN, TEL. 61223-61476

شارپ۔ فلپس
ھٹاچی، نیشنل، توشیبا
و
دیگر کمپنیوں کی مصنوعات
کی فروخت کا
قابل اعتماد ادارہ
الفاروق الیکٹرانکس
حسین آگاہی روڈ۔ ملتان

پارچہ جات کی نت نئی ورائٹی
اور ریڈی میڈ ملبوسات
کا مرکز
فینسی کلاتھ ہاؤس
قائداعظم شاپنگ سنٹر ملتان

کتابوں کی دنیا میں
ایک معیاری
نام
کتاب نگر
۲۲- حسن آرکیڈ
نصرت روڈ- ملتان کینٹ

بناسپتی
عظمت
وٹامن اے اور ڈی سے بھرپور
16 KG
عظمت گھی ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ